مئی ، جون
۱۹۷۸ء

صحیفہ

مجلس
ترقی
ادب
لاہور
کا
علمی
و
ادبی
مجلہ

مجلس ادارت
احمد ندیم قاسمی
کلب علی خاں فائق
یونس جاوید

مجلس ترقیٔ ادب ۲۔ کلب روڈ، لاہور

فہرست

مضامین

آثار البیرونی — محمد اکرام چغتائی — ۱
اُردو تنقید پر انگریزی اثرات — ڈاکٹر سلیم اختر — ۳۱
حیاتِ جاوداں — محمد عبداللہ قریشی — ۵۴

غزلیں

شہرت بخاری — ۶۵
شہزاد احمد — ۶۷
رشک خلیلی — ۶۸
سید یاسین قدرت — ۶۹

شہر خیال

سلیم شاہد — ۷۰

نظمیں

چھ رنگیں دروازے — منیر نیازی — ۷۳
کیتھارسس — کشور ناہید — ۷۴
کافی — سرمد صہبائی — ۷۶
خیال رکھنا — نجیب احمد — ۷۸

خاکہ

آغا شاعر قزلباش دہلوی — غلام عباس — ۷۹

کہانیاں

اند مال — احمد ندیم قاسمی — ۸۶
چینی کا پیالہ — خالدہ حسین — ۹۷

تراجم

(وبت نام)	لوہو : احمد ندیم قاسمی	۱۰۶
(فرانسیسی)	گلوم اپولی نیر : عزیز حامد مدنی	۱۰۷
(انگریزی)	ربرٹ برک : جابر علی سید	۱۰۸
(جنوبی افریقہ)	کاسمو پاٹرس : امجد اسلام امجد	۱۰۹
(پشتو)	خوشحال خاں خٹک : خاطر غزنوی	۱۱۱
(بلوچی)	نامعلوم : میر خدا بخش بجارانی مری	۱۱۲

رفتار ادب (تبصرے)

علم و آگہی	مبصر : کلب علی خاں فائق	۱۱۳

سرورق : نسرین انجم

محمد اکرام چغتائی

آثار البیرونی
(اضافات)

دو سال قبل راقم کی ایک کتاب بعنوان ''آثار البیرونی'' شائع ہوئی تھی (لاہور ، ۱۹۷۶ء ، ص ۱۳۶) - یہ کتاب بنیادی طور پر بیرونی کی مختلف النوع موضوعات پر تحریر کردہ تصنیفات (کل تعداد ۱۸۱) پر مشتمل ہے ، لیکن اسے صرف کتابوں کی فہرست سازی تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ اس کی تدوین میں جدید تحقیق کے ان پہلوؤں کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے ، جو ایسے کاموں کے لیے بنیادی حیثیت کے حامل ہیں - مثال کے طور پر اس کتاب میں بیرونی کی متعدد تصانیف کے اصل منابع کی نشاندہی کی گئی ہے - دنیا کے جس جس کتب خانے میں ان کے خطی نسخے محفوظ ہیں ، ان کا حوالہ دیا گیا ہے اور اگر کوئی کتاب کہیں سے طبع ہوئی ہے ، تو اس کا مقام اشاعت اور سنہ اشاعت کا ذکر کیا گیا ہے - مزید برآں بیشتر تالیفات کے تنقیدی اور تحقیقی مطالعات (بصورت کتاب و مقالہ) اور ان کے دیگر زبانوں میں تراجم کے مکمل حوالے بھی درج کیے گئے ہیں - مختصراً اس کتاب کی تدوین میں برا کلمان اور اسٹوری کے طرز کو اپنانے کی حتی المقدور کوشش کی گئی ہے -

راقم نے اپنی اس کتاب کو ہر لحاظ سے مکمل کرنے کی پوری سعی کی اور اسی مقصد کے پیش نظر اس میں بیرونی کے ہزار سالہ جشن ولادت (۱۹۷۳ء) کی مختلف ممالک مثلاً پاکستان ، ایران ، ترکی ، افغانستان ، بھارت ، امریکہ وغیرہ میں حکومتی یا نجی سطح پر جو تقریبات منعقد ہوئیں اور ان میں دنیا کے معروف دانشمندوں نے جو گرانقدر مقالات پڑھے ، انہیں بھی شامل کر لیا گیا ، لیکن ان کتابوں کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ انھیں کامل نہیں کہا جا سکتا اور ان میں اضافوں کی گنجائش ہر وقت رہتی ہے - چنانچہ کتاب کی طباعت کے دوران پاکستان کی معروف علمی شخصیت ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کی فراہم کردہ کتابوں سے اخذ شدہ معلومات کو ضمائم کے طور پر اپنی کتاب میں شامل کرنا پڑا - اس ضمن میں اس کتاب کے دیباچہ نگار سید حسام الدین راشدی صاحب نے

وہی سہی کسر پوری کر دی اور انھوں نے بیرونی کے سوانح حیات اور افکار و آثار پر محققانہ بحث کے ساتھ ساتھ بعض نئے مصادر کا بھی حوالہ دے دیا ، لیکن بیرونی کے متعلق جو نئے مآخذ ان کی نظر سے نہیں گذرے تھے ، ان کا راقم نے اپنے پیش لفظ میں ذکر کر دیا اور یوں متذکرہ بالا کتاب اضافہ در اضافہ کے سلسلوں سے ہوتی ہوئی بازار میں آئی ۔

گذشتہ دو سالوں میں بیرونی کے حالات زندگی اور افکار پر قابل قدر کام ہوا ہے ۔ اس دوران میں اس کی بعض کتابوں کے لیے تنقیدی متون طبع ہوئے ہیں ۔ ہزارہ' بیرونی کے سلسلہ میں منعقدہ تقریبات میں جو گرانقدر تحقیقی مقالات پڑھے گئے ، انھیں مجموعوں کی صورت میں منظر عام پر لایا گیا اور علمی اجتماعات کی کارروائی پر مشتمل علیحدہ کتابیں شائع ہوئی ہیں ۔ علاوہ ازیں مختلف مغربی اور مشرقی مجلوں میں بیرونی پر بعض مفید مضامین بھی لکھے گئے ہیں ۔ ان نئے مطالعات کی افادیت کے پیش نظر ان کو یکجا کر کے بطور ذیل میں قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے ۔ اس اعتبار سے زیر نظر مقالے کو راقم کی محولہ بالا کتاب کا تکملہ سمجھا جا سکتا ہے ۔

اس فہرست کو مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے :

۱ - روس کو بیرونی شناسی میں بلند مقام حاصل ہے ۔ بیرونی کی چند کتابوں کے متون اور بعض کے تاجیکی اور اوزبکی زبانوں میں تراجم شائع ہوئے ہیں ۔ ان میں سے بعض کے حوالے "آثارالبیرونی" میں درج ہیں ، لیکن وہ ناکافی ہیں ۔ اب اس موضوع پر جس قدر نئی معلومات دستیاب ہوئی ہیں ، انھیں مختلف عنوانات کے تحت یکجا کر دیا گیا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ جہاں کسی کتاب یا رسالے کا عنوان روسی زبان میں ہو ، تو اس کے ساتھ ہی قارئین کی سہولت کے لیے اس کا اردو ترجمہ بھی درج کر دیا جائے ۔ ہمارے کتب خانوں میں روس کے علمی اور تحقیقی جرائد اور کتب کی جو کمی ہے ، وہ ارباب تحقیق و تدقیق سے پوشیدہ نہیں ، لیکن اس کے باوجود راقم نے زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے ، مگر اس کے باوجود اضافوں کی گنجائش اب بھی باقی ہے ، کیونکہ ایک روسی مستشرق بوگولیوف لکھتا ہے :-

"درطی بیست و پنج سال اخیردر اتحاد شوروی بیشتراز ۲۵۰ مقالہ و مجموعہ و کتاب مربوط بہ تحقیق میراث علمی بیرونی از طبع در آمدہ است ۔"[1]

---

۱ - رک : بذیل "افغانستان" شمارہ ۱ (۳) ، ص ۲۸ ۔

۲ - اس حصے میں یورپ اور امریکہ میں بیرونی کے متعلق تحقیقات کو الفبائی ترتیب سے درج کیا گیا ہے ، بالخصوص ہزارہ" بیرونی کے سلسلہ میں نیویارک اور دانشگاہ کولمبیا میں جو مقالات پڑھے گئے ، ان کو بھی شامل کیا گیا ہے -

۳ - ایران میں بیرونی پر جتنی کتابیں اور مقالے شائع ہوئے ہیں ، یہ حصہ ان پر مشتمل ہے -

۴ - پاکستان میں ہزارہ" بیرونی کے کئی اجلاس منعقد ہوئے تھے اور ان میں ملکی اور غیر ملکی اصحاب علم نے اپنے مقالات پڑھے تھے ، جن کا حوالہ "آثار البیرونی" میں درج ہے ، لیکن بدقسمتی سے یہ اہم ذخیرہ ابھی تک طبع نہیں ہوا - اس لیے راقم کو بامر مجبوری اخبارات اور دیگر ہلکے پھلکے رسائل سے استفادہ کرنا پڑا -

۵ - اس حصے میں افغانستان نے بیرونی پر جو تحقیقی کام کیا ہے ، اس کو سامنے لایا گیا ہے - نیز وہاں کے اجلاسوں اور منظور کردہ قراردادوں کی تفصیل بھی درج کی گئی ہے -

۶ - اس میں بھارت سے شائع ہونے والے چند مقالات کے حوالے درج ہیں -

۷ - یہ حصہ متفرقات پر مشتمل ہے -

روس

ا - سوانح حیات اور کتب عمومی :

1. Abdullaev, Kh. M. : The Importance of Biruni's Writings in the Development of Science.
(Materialy' pervoi Vsesoyuznoi Konferentsii Vostokovedov V. g. Tashkente, 4-ii Jyunya 1957, Tashkent, 1958, pp. 115—24).

2. —————— : Biruni i znachenie ego rabot v razvitii nauki [البیرونی اور سائنس کی ترقی میں اس کی تصانیف کی اہمیت]
(In : Abdullaev, Kh. M. : Sobranie Sochinenii [مجموعہ مضامین] vol. vii, Tashkent, 1969, pp. 277—86).

۱ - پہلی آل یونین مستشرقین سائنسی کانفرنس (منعقدہ ۴ تا ۱۱ جون ، ۱۹۵۷ء در تاشکند) میں پڑھے جانے والے مقالات -

3. Belenitzkii, A.M. : A Short Sketch of the Life and Works of Biruni.
(In : Al - Biruni, Sohranie svedenii dlya poznaniya dragotsenmostei (mineralogiya) [البیرونی، قیمتی پتھروں (علم معدنیات) کے علم کے متعلق مجموعہ معلومات], Leningrad, 1963, pp. 271—91).

4. Biruni, Abu Rayhan. Selected passage — in : Biruni - Velikii Uchenyi Srednevekovya [بیرونی، قرون وسطیٰ کا عظیم سائنسدان] Tashkent, UzSSR, 1950, pp. 169—246. [اوزبکی ترجمہ دستیاب ہے]

5. Biruni, Abu Rayhan. Shornik Statei [مجموعہ مقالات], ed. hy S. P. Tolstov, A. S. USSR (M-L, 1950), 140 p., with illustrations.

6. ————————, Biruni and the Humanities. (Nauch. sessiya AN UzSSR, posvyashchennoi 998-i godovshchine so dnya rozhleniya Abu Raikhana Beruni. [ابوریحان بیرونی ۹۹۸ ویں سال ولادت کے موقع پر ازبکستان، تاشکند، کی اکادیمی برائے علوم کا سائنسی اجتماع]
Tashkent : "FAN", 1972), 136 p.
[اوزبکی ترجمہ دستیاب ہے]

7. ————————, Abu Rayhan Muhammad Ibn Ahmed — in : Sovetskaya Istoricheskaya Entsiklepediya [روسی تاریخی انسائیکلوپیڈیا] vol. 2, Moscow, 1960, 466 p.

8. ———, ———in : Bolshoy Soviet Encyclopedia (General editor A. M. Prokhorov), 3rd ed., vol. iii (Moscow, 1970), pp. 394—5 (cols. 1170—1).

9. ———————— : 1000-letiui so dnia rozhdeniia [بیرونی کا ہزار سالہ جشن ولادت] Tashkent, 1973.

10. ————————, Tukilghan Kunining 1000-Yilligiga [بیرونی کا ہزار سالہ جشن ولادت] Tashkent, 1973.

11. Bulgakov, P.G.: K. Biografil Biruni [بیرونی کے حالات زندگی]
(In: Narody Azii i Afriki
[ایشیا اور افریقہ کی اقوام], (1966)/4, pp. 195—9).

12. ——————— : Biruni and his place in the history of science of Central Asia.
(In : XXIV Sezd KPSS i zadacni razvitiya ohschestvennyx nauk
[روس کی کمیونسٹ پارٹی کا چوبیسواں اجلاس اور عمرانی علوم کی نشو و نما کے مسائل]
Tashkent : "FAN", 1972, pp. 469—76).

13. ——————— : Zhizn i trudi Biruni [زندگی و آثار بیرونی] Ed. I.M. Muminov, Tashkent : "FAN", 1972, 425 p.

14. Derghavin, V. : Singer, Philosopher and Humanist.
In : Druzhba narodov [دوستی اقوام], 1965, no. 3, pp. 233—4).

15. Hatipov, A.E.A. and Pulatov, A. :
Ahu Rayhan al-Biruni—Trudy Samark. gos. Un-ta [دانشگاہ ریاست سمرقند کی روداد], 1972, no. 229.

16. Irisov, A. : On the occasion of the Birth Millenary of Biruni.
(In : ONU, 1973, no. 1, pp. 71—2)

17. Karimov, U. I. : On the Date of al-Biruni's Death.[1]
(ONU, no. 8 (1970)

18. Kedrov, B.M. and Rosenfeld, B.A. :
Ahn Rayhan Biruni,
Moscow, 1973, 55 p. [در زبان روسی]

19. Krachkovsky, I. Yu. :
Homer and al-Biruni.
(In : Izbrannie sochineniya [مقالات منتخبہ], M-L, 1957, ii, pp. 80—7).

---

۱ - اس مقالے میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ بیرونی ۱۰۵۰ع کے بجائے ۱۰۴۸ع میں فوت ہوا تھا -

20. Mikluho-Maklai, N.D. :
Opisanie Tadzhikskikh persidskikh rukopisei Instituta Narodov Azii
[فهرست مخطوطات فارسی و تاجیک در ادارۂ اقوام ایشیا]
Editor-in-Chief: I.A. Orheli and V.I. Belyaev, No. 2 Biographical works. Moscow Puhlishing house--Eastern literature, 1961 p. with illustrations (AS, USSR, Institute of the Peoples of Asia) No. 4, Biographies of Philosophers and Scientists, pp. 64—7 Biruni, Ibn Sina and others. No. I, 1955, vide "Index" vol. 3 no. 268.

21. Rainov, T.I. :
Al-Biruni veliky uchenyi Srednei Azii
[البیرونی ، وسطی ایشیا کا عظیم سائنس دان]
(In : Bull. de l'Acad. des Sc. de St. Petershourg, classe de Sc. litteraires (1949) viii, pp. 101—16).

22. ———————— : Velikie uchenye Uzbekistana
[اوزبکستان کے بڑے علماء]
AS, UzSSR, Institute of Asia, Dept. of Literature and History (1949).

23. Rosenfeld, B. A., Rozhanskaia, M.M. & Sokolovskaia, Z.K. :
Ahu Rayhan al-Biruni, 973 - 1048.
Moscow, 1973. 271 p.

24. Semenov, A. A. :
Al-Biruni Velichaishii Uchenyi srednevekovogo Vostoka i Zapada
[البیرونی ، قرون وسطیٰ میں مشرق و مغرب کا عظیم سائنس دان]
(In : LIU (1938), i, pp. 106—16).

25. Sharipov, A. :
The Great Thinker Biruni.
Tashkent, 1972, 174 p.

26. Tolstov, S. P. : Biruni and His Times.
(In : BS, pp. 3—29).

27. Usmanov, M. : Ar-Razi and Biruni.
(ONU, 1972, no. 9, pp.17—21).

28. ——————— : Al-Biruni as a thinker.
(In: Izv. AN. USSR, ser. istorii i filosofii
[روس کی سائنسی علوم کی اکادمی' سلسلہ تاریخ و فلسفہ]
1949, vol. 6, no. 2, pp. 120--33. Also in : BS, (1950), pp. 30—54).

29. Zahidov, V. Yu. : Al-Biruni, the great Uzbek Savant of the Middle Ages (1950)
(An article in no. 4 above)

ب ۔ متون اور روسی تراجم :

30. Belenitzky, A. M. : "کتاب الجاہر فی معرفۃالجواہر" کے ایک باب کا ترجمہ
(In : BS, pp. 131—9).

31. Al-Biruni/Abu Rayban Ihn Ahmed :
Al-Biruni on Indian Rashikas.
(In : Iz istorii naukii tekhniki v stranakh Vostoka
[ممالک شرقیہ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تاریخ]
no. 3 (Moscow, 1963), pp. 148—62).

32. Al-Biruni (362/973—440/1048 or 442/1050—1).
(In : Drevnie i srednevekovye istochniki pe etnografii i istorii narodov Afriki yuzhnee Saxary
[افریقہ (جنوبی سہارہ) کی اقوام کی تاریخ اور نسلی جغرافیہ کے قدیم اور وسطی ماخذ]
Ed. and tr. by V.V. Matveev and L.E. Kuhhel (M-L, 1965), pp. 100—43).

33. Biruni, Abu Rayhan, IP, Selected Works, vol. I. tr. by M. A. Salie with an Introduction by S.P. Tolstov and V.P. Soeglev, Tasbkent, 1957, 486 p.; Vol. II : Indiya [پهندوستان], Cbief Ed. V.I. Belyaev, tr. by A. B. Khalidov and Yu. N. Zavadovski. Commentary by V. G. Erman and A.B. Khalidov, Tasbkent. 1963, 727 p. ; (Botb published by AS, UzSSR), vol. III : Geodeziya [علم مساحت ارض], Introduction, tr. and annotation by P.G. Bulgakov, Tasbkent : "FAN", 1966. Includes a tr. of the [تحدید نهایةالاماکن¹] of Biruni, 361 p.; Vol. IV : Pharmacognozy [بزبان روسی] vol. V, pt. 1 : Canon Masudicus [بزبان روسی و اوزبکی]; Vol V, pt. 2; [بزبان روسی و اوزبکی]; vol. VI : Astrology [بزبان روسی] ۲

34. Biruni, Abu Rayhan Mobammad bin Ahmad : Collection of Information about Precious Stones (Mineralogy) or Sobranie svedenii dlya Poznamia drago dragotsennostei (mineralogia) tr. from كتاب الجماهر فى معرفة الجواهر by A.M. Belenitzki, G.C. Lammlein and others, AS, USSR. (M—L, 1963), 518 p. with illustrations.

35. Biruni : كتاب الاستخراج الاوتاد فى الدائرة or A Treatise about the Determination of a Cbord (Maths) in a Circle witb the help of a Broken Line Drawn in it. Russian tr. by C.A. Krasnova and L.A. Karpova witb Commentary by

---

۱ - بتحقیق P. G. Bulgakov ، قاہرہ ۱۹۶۲ء — مجلة معهد المخطوطات العربیه ، ۸ (رک : آثار البیرونی ، ص ۵۸) -

۲ - جلد چهارم تا ششم زیر طبع ہیں -

B.A. Rosenfeld and C.A. Krasnova in : Iz istorii nauki i tekhniki v stranakh Sh. Statei [ممالک شرقیہ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تاریخ], Collection of Articles, no. III (Moscow, 1963), pp. 93—141).

36. Biruni, Extracts from the Philosophical texts of the hook "Materialy po istorii progressivnoi ohschestvenno-filosofskoi mysli V Uzhekistane." [اوزبکستان میں ترقی پسند سماجی / فلسفیانہ فکر کے متعلق مواد]

Tashkent, 1957, pp. 83—109.

37. Biruni, Ahu Rayhan, "On Kahruha or Amber," tr. and commentary hy A.M. Belenitzki and G.G. Lammlein in : BS, (M-L, 1950), pp. 131—9. (Tr. of a chapter of [كتاب الجماهر], pp. 210—2).

38. Biruni, Ahu Rayhan, "Badakhshanski Lal", Introduction and tr. A. M. Belenitzki, in : Shornik Statei po istorii if filologii narodov Srednei Azii [وسطی ایشیا کی اقوام کی تاریخ اور لسانیات پر مجموعۂ مقالات]

Puhlished on the occasion of the 80th Birth Anniversary of A.A. Semenov, Dushanhe : TAS, 1953, pp. 25—31. Proceedings vol. no. 17.

ج - فلسفہ٬ علم کائنات و منہاجیات :

39. Djahharov, Zh : The atheistic motives in elemental materialism of Biruni and of other thinkers of Central Asia of viii—xi Centuries. On the occasion of Biruni's 1000 Birth Anniversary in : ONU (1972), no. 4 pp. 30—4.

40. Zavadovski, Uu. No. : On the Philosophical Debates between Ibn Sina and Biruni.
(In : Ibn Sina. Materialy nauchnoi sessii Akademii naukuzb. SSR, posvyasch. 1000-letnemy yubileyu Ibn-Siny.
[ابن سینا : روس کی سائنسی علوم کی اکادیمی کے سائنسی اجلاس ، بمناسبت ہزار سالہ جشن ولادت ابن سینا ، میں پڑھے جانے والے مقالات]
Tashkent, AS, UzSSR, 1953, pp. 46—56 with illustrations.

د ـ ریاضیات :

41. Bulgakov, P.G. : Biruni's Geodesy as a historical-astronomical monument. (In : IAI, no. II (Moscow, 1972) pp. 181—90).

42. ——————: The early treatise of Biruni on the Sextant of al-Fakhri, (IAI, no. II (Moscow, Science Pusl., 1972), pp. 211—19).

43. Hatipov. A. E. : Short essays on the history of mathematics and astronomy in Central Asia.
(In : Trudy Samarkand gos. Un-ta
[دانشگاہ ریاست سمرقند کی رو داد]
1962, New series no. 119 Sec. 3. pp. 3—18. Abu Rayhan al-Biruni, pp. 5—8).

44. Matvievskaya, K.P. : K istorii matematiki Srodnei Azii IX—XV Vekov.
[نویں سے پندرھویں صدی عیسوی تک وسطی ایشیا میں تاریخ ریاضیات کے متعلق]
Tashkent, 1962, 125 p. Al-Biruni, pp. 56—60.

45. Rosenfeld, B.A. : An attempt at Quadratic Interpolations by Abu Rayhan al-Biruni.
(In : IMI, no. 12 (Moscow, 1959), XII, pp. 421—30).

46. Rosenfeld, B.A. : A letter to the Editor concerning a formula of al-Biruni, in : JMI, No. 15 (Moscow, 1963), XV, 473 p. (Corrigenda to no. 45 above).

47.——and Yushkevich, A.P. : Mathematics in the Near and Middle East during the Middle Ages.
(In : Iz istorii nauki i tekhniki v stranakh Vostoka..., 1960, Vyp 1, pp. 349—421).

ه ـ فلكيات و علم النجوم :

48. ——————— : Stellar Catalogue hy al-Biruni with Supplementary Catalogues by Khayyam and Nasir ud-Din at-Tusi.
Russian tr. with an Introduction in : IAI, VIII (1962), pp.83—192.

49. ——and Rozhanskaia, M. M. : Al-Biruni's Astronomical Work. Canon Masudicus.
(IAI, no. x (1969), pp. 63—95).

50. Sadikov. Kh. U. : The Astronomical Theories of Al-Biruni. (BS, pp. 74—87).

51. Umarov, G. Ya : Biruni, Kopernik i sovremennaya nauka [بیرونی ، کوپرنیکس اور ہمعصر سائنس]
Tashkent : "FAN", 1973, 120 p.

و ـ تقویم و تاریخ :

52. Djalalov, G.D. ; Indian Astronomical Prohlems in Biruni's "Book on India".
(In : Voprosy istorii fiziko-matematicheskikh nauk, nauki i tekhniki v Stranakh [طبیعی/ریاضیاتی علوم کی تاریخ کے مسائل]
Moscow, 1963, pp. 468—71).

53. Khalidov, A B. : Additions to al-Biruni's "Chronology" from the Leningrad and Istanbul manuscripts. (In : PS, LXIII/4 (1959), pp. 147—71).

54. Rosenfeld, B.A. : Notes on Biruni's Indian Rashikas. (In : Iz istorii nauki i tekhniki v stranakh Vostoka : Sh. statei
[ممالک شرقیہ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تاریخ—
مجموعۂ مقالات]
No. 3 (Moscow, 1963), pp. 163—7. (Notes to no. 31 above).

55. Tolstov, S.P. : Biruni and the problems of Early Medieval History of Khwarizm. (In : Vsesyuznaya nauchnaya konferentsiya vostokovedov V Tashkent, 4—11 iyunya, 1957 [رک شمارہ ۹ ، مذکورہ]
Tashkent, 1958, pp. 125—30).

56. ——— ———: Po sledam drevnekhorezmiiskoi tsivilizatsii
[قدیم خوارزمی تہذیب کے نقش قدم پر]
M-L, AS, USSR, 1968, 322 p. Ch. 10. Biruni's period, pp. 234—73.

57. Belenitzkii, A.M. : Kartina mira po Biruni
[تصویر دنیا بحوالہ بیرونی]
(In : UZLGU, No. 98 (1949), I, pp. 203—14).

ز - جغرافیه و موسمیات :

58. Bulgakov, P.G. : Biruni's Globe. (ONU, Tashkent 1965, no. 1, pp. 39—44).

59. Gehtman, G. N. : Vydayushchiesya geografy i puteshestyenniki
[قابل ذکر جغرافیہ داں اور سیاح]
Tiblisi, 1962, 307 p. Al-Biruni, pp. 10—2.

60. Hasanov, H. H. : Three maps attrihuted to Biruni.
In : Izv. Uzh. filiala geogr. O-VaSSER
[روس کی جغرافیائی انجمن کی اوزبکی شاخ کا مجلہ]
Vol. 5 (1961), pp. 150—1).

61. ——————: Geographical tables of Biruni and Ulughe g. (In : Nauch Trudy
[دانشگاہ ریاست تاشکند کی سائنسی رودادیں بمناسبت لینن]
Tashkent 1967, no. 310, pp. 3—14, Bihliography, 23 Titles).

62. —————— : Ahout Meteorology and climatology of Biruni. (In : Nauch Trudy, ihid., 1962, no 193, pp. 11—14).

63. Krachkovsky, I. Yu. : Biruni's Role in the History of Oriental Geography.
(In : BS, pp. 55—73).

64. —————— : Arahic Geographical Literature.
(In : IS, vol. IV, M-L, 1957).

65. Mandelshtam, A.M. : On Biruni's Data concerning the Pamirs and the regions adjacent to it.
(In : Ellinisticheskii hlizhnii Vostok, Vizantiya i Iran. Istoriya i filologiya
[یونانی مشرق قریب - بازنطین اور ایران ؛ تاریخ اور لسانیات]
Moscow : Nauka, 1967, pp. 186—96).

66. Sadykov, Kh. U. : Biruni i ego rohoty po astronomii i matematicheskoi geografii
[بیرونی اور فلکیاتی و ریاضیاتی جغرافیہ پر اس کی تالیفات]
Edited hy B.V. Kukharkım, Moscow 1953, 152p. with illustrations. Bibliography, pp. 148—51 (64 titles) and also hibliographical notes.

67. Sadykov, Kh. U : Abu Rayhan Biruni and his works on astronomical and mathematical geography. Diss. na soiskanie uchen. stepeni kand. fiziko-matem. nauk
[مقالہ برائے پی ایچ - ڈی کا ایک خاکہ]
Moscow 1950, 1+152+30p., Illustrations; 15, 1. facsim (Astronomical Council of AS, USSR) Bibliography : pp. 146—52.

ح ۔ طبیعیات ، کیمیا و معدنیات :

68. Belenitzki, A.M. : Biruni's Researches on specific Weights of Metals.
(In : Kratkie soohshcheniya In-ta vostokovedeniya AN, SSR
[روس کے ادارہ علوم شرقیہ کی مختصر رپورٹیں]
1961, vol. 44, pp. 59—66. Bibliography in footnotes).

69. ———————— : The 11th Century Great Central Asian Encyclopaedist Al-Biruni on the mineral wealth of Central Asia.
(In : Priroda [فطرت], Moscow 1949, no. 8, pp. 73—7).

70. ———————— : Biruni's knowledge of Mineralogy, (BS, pp. 88—105).

71. ———————— : The chapter 'On Iron' in Biruni's treatise on Mineralogy.
(In : Kratkie Soobshcheniya o dokladax i polevych issledovaniyax In-ta istorii materialnoi kultury
[تاریخ ثقافت مادیہ کے خطبات اور میدانی تجزیے کے متعلق مختصر رپورٹیں]
Moscow 1950, no. 23, pp. 139—44)[1]

---

۱ ۔ کتاب الجاہر ، بتحقیق کرینکو (حیدرآباد ، ۱۹۳٦ء) کے ایک باب کا ترجمہ ۔

72. Islamov, O.I. : Contrihution of the scientists of Central Asia to Geological science in the period IX—XI Centuries,
(In : Prohlemy istorii geologicheskikh nauk
[تاریخ علوم ارضیاتی کے مسائل]
Moscow : "Science", 1968, pp. 24—31. Biruni at pp. 26—8. Bihliography : p. 31. Summary in English).

73. Kolchin, B.A. : Some ohservations on the chapter 'On Iron' in Biruni's Treatise on Mineralogy,
(In : Kratkie soohsheniya O dokladax i polevikh issledovaniyax In-ta istorii materialnoi Kultury
[رک بذیل ; شمارہ ۱ے]
Moscow, 1950, no. 33, pp. 145—51. Bihliography in the footnotes).

74. Lemmlein, G. G. : Biruni's Teachings on Mineralogy.
(BS, pp. 106—27).

75. ——————— : Biruni on Bronze and Brass,
(In : KSINA, 44 (1961), pp. 59—66).

76. Marupov, N. : Works of Biruni on the determination of specific Weights.
(In : "Uchen. zap" [تدریسی ادارہ ، دو شنبہ ریاست،
بمناسبت T G. Shevchenko ' کی سائنسی یادداشتیں]
1970, vol. 72, pt. 2 (شعبہ' طبیعیات), pp. 54—79).

77. ——————— : Biruni ahout the units of measurements of physical quantities.
(In : "Uchen. Zap", (Dushanhin. gos. ped. i. T in T.G. Shevchenko) [76 رک بذیل شمارہ], 1971, vol, 81, pp. 91—102. Bihliography : 7 titles).

ط ـ عام الادویہ ، عام طب و علم الحیوانات :

78. Karimov, U.I. : وكتاب الصيدنة Pharmacology of Biruni, (In : Avtoreferat diss. na soiskanie (Uchen) stepeni d-ra filol. nauk [لسانیاتی علوم میں مقالہ برائے پی ایچ - ڈی کا خاکہ], Tashkent : "FAN", 1971. Uzbekistan AS. The joint Academic Board on Philology under the Department of History, Linguistics and Literatures).

79. ———————— : Biruni's "كتاب الصيدنة" (Pharmacology) or "Pharmacology in Medicine", (In : ONU, No. 5 (1970), pp. 55—9).

80. ———————— : Prohlems of Philology in "كتاب الصيدنة" (In : ONU, No. 10 (1970), pp. 68—70)[1].

امریکہ اور یورپ

1. Bausani, A. : Al-Biruni, un gram pensatore del medioeve islamico, nel millenario della nascita. (RSO, 48 (1973—4), pp. 75—97)

2. ———————— : Some Considerations on three Prohlems of the Aristotelim controversy between al-Biruni and Ihn Sina. (In : Akten des VII. Kongresses fuer Arabistik and Islamwissenschaft, Goettingen, 15. bis 22. August 1974. Hrsg. von Albert Dietrich. Goettingen, 1976)

3. Bivar, A.D.H. : The Stations of Al-Biruni on the Journey from Ghazna to Peshawar. (Forthcoming in "Al-Biruni Millenary Commemoration Volume", Karachi)

---

۱ ـ نیزرک : متفرقات ، شمارہ ۱۱ - ۱۹

4. Boncompagni, Baldassare :
Intorno al' opera d' Albiruni sull' India.
Roma, 1869. ii + 54 p.
[''آثار البیرونی'' میں اسی مصنف کے ایک مقالہ کا حوالہ دیا گیا ہے (ص ۳۹ شمارہ ۹۳) جس کا سال طباعت ۱۸۶۹ء ہی ہے ، لیکن یہ کتاب اس سے الگ ہے]۔

5. Bruce B. Lawrenee : The Use of Hindu Religious Texts in Al-Biruni's "India" with Speeial Reference to Patanjali's Yoga-Sutras.
(In : The Scholar and the Saint. Studies in Commemoration of Abu'l-Rayhan al-Biruni and Jalal al-Din al-Rumi. Edited hy Peter J. Chelkowski. New York, 1975, pp. 29—48)1

6.——————: Al-Biruni's Approach to the Comparative Study of Indian Culture.
(In : Biruni Symposium. Ed. Ehsan Yarshater, Iran Center, Columhia University, 1976, pp. 27—47)

7.——————: Al-Biruni and Islamie Mysticism.
(Forthcoming, see no. 3)

8. Caspar, Robert : Bibliographie du dialogue Islamo-chrétien (Pt. II).
(Islamochristiana (Roma), 2(1976), p. 197, no. 21.4)

9. Ehied, R.Y. : Bibliography of mediaeval Arahie and Jewish Medieine and Allied Seiences. London, 1971.

---

۱ ۔ یہ اور اس کے علاوہ مقالہ نمبر ۱ ، ۱۶ ، ۲۰ ، ۳۴ ، ۳۰ ، ۴۲ اور ۴۶ ہزارہ بیرونی کے سلسلے میں پڑھے گئے تھے۔ ان کا حوالہ ''آثار البیرونی'' میں درج ہے (ص ۱۰۶) ، لیکن اس وقت ان کا مطبوعہ متن پیش نظر نہیں تھا ۔

10. **Ehsan Yarshater :** Lists of Achaemenid Kings in Biruni and Bar Hebraeus.[1]
(See no. 6, pp. 49—65)

11. **Embree, Ainslee T. :** Foreign Interpreters of India : The Case of al-Biruni.
(See no. 5, pp. 1—16)

12. **Gardet, Louis :** Deux grands maître : Al-Biruni et Albert le Grand (Essai de typologie comparative).
(Islamoebristiana, 1(1975), pp 25—40)

13. **Gohlman, William E. (ed.) :** The Life of Ibn Sina. A critical Edition and Annotated Translation by W.E.G.,
New York, 1974, pp. 103, 119, 124, 140.

14. **Griveau, R. :** Les fêtes des Melchites par Abou Rihan al-Birouni.
(Patrologie Orientale, 10 (1915). pp. 289-312)
متن اور فرانسیسی ترجمہ مع تعارف و حواشی

15. **Haynes, John R. (ed.) :** The Genius of Arab Civilization. Source of Renaissance. New York, 1975, pp. 121, 128, 130, 135, 159, 162.

16. **Heinen, Anton M. :** A Priori Positions Determining al-Biruni's Scientific Work.
(See no. 5, pp. 49—66)

17. **Humbach, H. :** Al-Biruni und die Sieben Strome des Awesta.
(Bull. Iranian Culture Found., 52 (1973), pp. 47—52)

18. **Kennedy, E.S. :** A Survey of Islamic Astronomical Tables.
Philadelphia, 1956.

---

۱ - یہ مقالہ "یاد نامہ بیرونی" (جلد دوم) میں بھی شائع ہوا ہے ، رک : بذیل "ایران" شمارہ د (٦) ۔

19. Kennedy, E.S. : The Planetary Equatorium nf Jamshid Ghiyath al-Din al-Kashi (d. 1429). With tr. and enmm.
New York, 1960, p. 167

20.————————: Al-Biruni no the Muslim Times nf Prayer. (See nn. 5, pp. 83—94)

21.————————: "Exact Sciences" (In : R.N. Frye (ed.): The Perind frnm the Arab Invasinn to the Saljuqs. Cambridge, 1975)

22.———————— and Yusuf 'Id in: Historia Mathematica, 1 (1974), pp. 3—11.

23. Khan, M. S. : Al-Biruni and the pnlitical history nf India. (Oriens (Leideo), 25-26 (1975), pp. 86—115)

24. Kreiser, K., Werner Diem und H G Majer (eds.) :
Lexikon der Islamischea Welt. Bd. 1, Stuttgart, 1974, p. 108

25. Lang, D.M. (ed.): The Penguin Companioo tn Literature, 1969, p. 233

26. Langar Mohamed: L'esprit de la science chez al-Biruni.
Ph.D. Thesis, Paris University, 1976.
Rnger Aroaldez زیر نگرانی

27. Lewicki, Tadeusz: Abu'r-Rajhan al-Biruoi jakn histnryk kultury materialoej
(Przeglad Orientalistycznz, 1974/2 pp. 95—102)

اس مقالے کا موضوع مادی تہذیب میں البیرونی کا حصہ ہے - اسی مصنف کا ایک مضمون تاشقند سے بھی شائع ہوا تھا (۱۹۷۳ء) -

28. Nallino, C. A. : Raccolta di scritti editi e inediti. Vol. II, Roma, 1940, pp. 423—4; vol. V, 1944, pp. 44—5 (قانون مسعودی), 55, 117—8 (قانون مسعودی),
("تسبیع" کے متعلق "الآثارالباقیہ" کے ایک اقتباس
158—61 ("سند ہند" 204—05 کا اطالوی ترجمہ اور اس
پر بحث) کے بارے میں "تحقیق" کی ایک عبارت کا اطالوی
ترجمہ) ("کلپ" یا "چتریوگ" کا اطالوی ترجمہ از "تحقیق"
207—08 ("کلپ" و "مہا یوگ"), 215—8, 220—
223, 225, 226—7, 232, 272, 276, 302—05, 326—7, 339—40 (بیرونی کے قانون مسعودی), 423, 434—5, 444 (مختصر حالات زندگی).

29. ———— : Al-Biruni.
(In : Enciclopedia Italiana, vol. V, pp. 339-40)

30. Nasr, S.H. : Annotated Bibliography of Islamic Science. Vol. I. Compiled by S H.N. with W.C. Chittick. Teheran, 1975.

31. ———— : Islamic Science. An Illustrated Study. London, 1976.

32. Newton, R.R. in : Memoirs of the Royal Astronomical Society. 76 (1972), pp. 99—128.
بحوالہ "تحدید الاماکن"

33. Nylander, C. : Al-Beruni and Persepolis.
(Acta Iranica (Leiden), I, 1974, pp. 137-50)

34. Peters, F.E. : Science. History and Religion. Some Reflections on the "India" of .....Al-Biruni.
(See no 5, pp. 17—27)

35. Pingree, D. : The Persian 'Observation' of the Solar apogee in C A D. 450.
(JNES, 24 (1965), pp. 334-6)

36. ————: The Paitamahasiddhaata of the Visnudharmottara-purana.
(Brahmavidya, 31-2 (1967-8), pp. 472—510)

37. Pingree, D. : Astronomy and Astrology in India and Iran.
(Isis, 54 (1963), pp. 229—46)

38. ——————: On the Greek origin of the Indian planetary model employing a double epicycle.
(JHA, III (1971), pp. 80-95)

39. ——————: Concentric with equant.
(AIHS, 24 (1974), pp. 26—9)

40. ——————: Al-Biruni's Knowledge of Sanskrit Astronomical Texts.
(See no. 5, pp. 67—81)

41. ——————: Brahmagupta, Balabbadra, Pithudaka, and Al-Biruni.
(to appear in the "Proceedings of the World Sanskrit Congress")

42. Roemer, H.R. : Research on Al-Biruni in Germany.
(See no. 5, pp. 95—102)

43. ——————: Al-Biruni-Forschung in Deutschland.
(Araber und Deutsche Begegnungen in einem Jahrtausend, eds. F.H. Kochwasser und H.R. Roemer, Tuebingen, 1974, pp. 122—32)[1]

"آثار البیرونی" میں اس مصنف کے ایک جرمن مقالے کا ذکر کیا گیا ہے (ص ۸۰ ، شمارہ ۱۰۳) - یہ مقالہ محولہ کتاب کے صفحات ۲۳-۲۹ پر ہے - متذکرۂ بالا دونوں مقالات میں اسی مضمون کو معمولی ترامیم کے ساتھ شائع کیا گیا ہے -

44. Rosenthal, F. : Al-Biruni between Greece and India.
(See no. 6, pp. 1—12)

---

۱ - لیزرک : بذیل 'ایران' شمارہ د (۱۲)

45. Stephen and Nandy Ronart : Lexikon der Arabischen Welt. Ein Historisch- Politisches Nachschlagewerk. Zuerich/Muenchen, 1972, pp. 261—2

46. Soucek, P. : An Illustrated Manuscript of Al-Biruni's "Chronology of Ancient Nations". (See no. 5, pp. 103—68)[1]

47. Suter, H. : Die Mathematiker und Astronomen der Araber. Leipzig, 1900 (Nachtraege und Berichtigungen in : Abhandlungen zur Geschichte der mathemat. Wissenschaften, XIV. Heft, 1902, pp. 157—85)

48. ——————: In : Bibliotheca Mathematica, III. Folge, IV. Bd., 1903, pp. 127—9.

49. Ullmann, Manfred: Die Natur-und Geheimwissenschaften in Islam. Leiden/Koeln, 1972, pp. 27, 33, 87, 93, 110, 116, 120-2, 138, 272, 335.

50. UNESCO. : Le Courrier de l'UNESCO, juin 1972. Titre de la couverture : "Autour de l'an mil en Asie Centrale, un esprit universel Al-Biruni".

51. Wieber, Reinhard: Ein Methode Biruni's zur Bestimmung der Qibla durch Konstruktion aus dem Mas'udischen Qanun. (V Maqala, Kap. 6)

---

۱ - الجبرا کے اس مخطوطے پر ایک اور اسکالر نے بھی مضمون لکھا ہے - رک : بذیل "ایران" شمارہ د (۱۷) - اس قلمی نسخے کے ورق ۹۳ پر ایک کتابی تصویر ہے، جس میں حسین ابن منصور حلاج کو تختہ' دار پر لٹکا ہوا دکھایا گیا ہے -

(ZDMG, Supplement III/I : XIX. Deutscher Orientalistentag vom 21. September bis 4. Oktober 1975 in Freiburg im Breisgau. Vortraege hrsg. von Wolfgang Voigt, Wiesbaden, 1977, pp. 625—8)

52. Youssefi, G H. : Àbu-Reyhan Biruni, A Lover of Truth. (See no. 6, pp. 13—26)

ایران

کتب :

(ا) واژہ ہای گویشی ایرانی در نوشتہ ہای بیرونی ۔ تألیف صادق کیا باہمکاری
محمد تقی راشد محصل ، تہران ۱۳۵۳ ، ص ۱۰۸
اس کتاب کا انگریزی عنوان یہ ہے :

Iranian Dialectical Words in Biruni's Writings

(ب) یاد نامہ' بیرونی ۔ جلد اول : مراسم بزرگداشت جہانی ابو ریحان بیرونی
تہران ۱۳۵۲ ، ص ۷۸
اس میں ہزارۂ بیرونی کی ان تقریبات کی تفصیلی روداد مع تصاویر شائع ہوئی ہے جو ایران کے مختلف شہروں میں منعقد ہوئی تھیں ۔

(ج) Dr. Zabiholla Safa: Al-Biruni. Ses Oeuvres et ses Pensées, Teberan, 1973, 38 p.

دکتر ذبیح اللہ صفا نے ایک کتاب بعنوان "احوال و آثار ابو ریحان بیرونی" (تہران ، ۱۹۷۳ء ، ص ۱۷۴) لکھی تھی ، جس کا حوالہ "آثارالبیرونی" کے تعارف میں پیر حسام الدین راشدی صاحب نے دیا تھا (ص۱۰) ۔ مذکورہ کتاب میں اسی کتاب کے مباحث کو ملخص صورت میں بزبان فرانسیسی تحریر کیا گیا ہے ۔

(د) The Commemoration Volume of Biruni International Congress in Tebran. B. Englisb and French Papers,[1] Tehran, 1976.

فارسی عنوان "یاد نامہ' بیرونی" ۔ یہ کتاب مذکورہ (شمارۂ ب) کی جلد دوم ہے اور اس میں ہزارۂ بیرونی کے موقع پر پڑھے جانے والے تیس

---

۱ ۔ ان میں سے کچھ مقالات کی فہرست 'آثار البیرونی' میں بھی دی گئی ہے (ص ۱۰۱ بعد) ، لیکن اس وقت یہ مقالے طبع نہیں ہوئے تھے ۔

الگریزی اور فرانسیسی مقالات کو شائع کیا گیا ہے ۔ مشمولہ مقالات کی
تفصیل درج ذیل ہے :-

1. Z. Safa : Al-Biruni Ses oeuvres et ses Pensées, 1-XXXV.
2. G. Morgenstierne: Al-Biruni, The Founder of Comparative Studies in Human Culture, 1—9.
3. C.E. Bosworth : The Khwarazmian Historical Backgroond to Biruni's Life, 11—27.
4. A. Rahman : Al-Beruni and Some Problems of Medieval Science, 29—36.
5. J. Duehesne-Guillemen : Congrès Al-Biruni, 37—43.
6. Ehsan Yarshater : Lists of the Achaemenid Kings in Biruni and Bar Hebraeus, 45—61.
7. Roshdi Rashed : Al-Biruni et l'algèbre, 63—74.
8. Fr. Georges Anawati : Le Kitab Al-Saydana d'Al-Biruni, 75—97.
9. J.A. Boyle : Biruni and Rashid Al-Din, 99—112.
10. L.P. Elwell-Sutton: Al-Biruni on the Aristotle, 113—27.
11. Jamshid Cawasji : Ancient Iranian Festivals according to Al-Biruni, 129—51.
12. 'Abdurrahman Badawi : Al-Biruni et sa connaissancede la philosophie grecque, 153—79.
13. H.R. Roemer : Al-Biruni in Germany, 181—91.
14. Louis Gardet : Quelques "Percées Philosophiques" de Biruni. Thémes et Méthode, 193—209.
15. Fonad Ephrem Bonstany : Le Calendrier óe l'Eglise Mélchited' Antiochedans l'Oeuvre d'Al-Biruny, 211—7.
16. J. Vernet Gines : Al-Biruni et les mouvements de la terre. 219—34.

17. Hertha Kirketerp-Moller : Paintings of Al-Atharu'l Baqiya in the Edinburg Manuscript, 235–45.[1]

18. Ibrahim Madkour: Al-Biruni et Ibn Sina, représentants d'une époque et d'une culture, 247—57.

19. Hakim Mohammad Said : Al-Biruni's Kitab Al-Saydanah, 259—65.

20. J.N. Mattock : The Citations from 'Plato's Phaedo' in Al-Biruni's 'Ta'rikh Al-Hind', 267—89.[2]

21. George A. Saliba: Christian Feasts in Biruni's Al-Qanun Al-Mas'udi, 291—364.

22. Ch. Buergel : Some New Material pertaining to the Quotations from Plato's Phaido in Biruni's Book on India, 365—77.

23. Albert Z. Iskandar: Studies in 'Risala Li-L-Biruni fi Fihrist Kutub Muhammad B. Zakariyya Al-Razi, 379—93.

24. Mubahat Turker-Kuyel : Les deux questions posées par Abu Rayhan Al-Biruni à Ibn Sina et les réponses qu'il a reçues de lui, 395—405.

25. John E. Murdoch: Transmission and Figuration: An Aspect of the Islamic Contribution to Mathematics, Science and Natural Philosophy in the Latin West, 407—37.

26. A. I. Sabra : The Physical and Mathematical in Ibn Al-Haytham's Theory of Light and Vision, 439—78.

---

۱ - حسین بن منصور حلاج کی کتابی تصویر کا عکس مع تفصیل، ص ۲۴۰-۲۴۱
۲ - لیز 'شمارہ ۲۲' مرقومۃ الذیل

27. A. Bausani : Christian Trinity in Al-Biruni and Ibn Rushd : Scientific vs. Philosophical Method, 479—93.

28. Ali Chahbi : La méthode historique chez Al-Biruny, 495—512.

29. F.C. Aulnck : Al-Biruni and Indian Astronomy, 513—33.

30. F. Rosenthal : On some Epistemological and Methodological Presuppositions of al-Biruni, 535—55.

31. M. Saghir Hasan Masumi : Al-Biruni's Devotion to the Qur'an, 557—78.

مقالات وغیره :

۱ - ابو ریحان بیرونی
(هنر و مردم ، فروردین ۱۳۵۲ ، شماره ۱۲۶ ، ص ۸۴-۹۱)

۲ - اکبر دانا سرشت : جغرافیائی قانون مسعودی
(راهنمای کتاب ۷ : ۳۹۲-۳۹۳)

۳ - باقر ، محمد : زندگی و مسافرتهای ابو ریحان بیرونی ، ترجمهٔ سروان مجید وهرام
(بررسی های تاریخی، شماره ۲، سال نهم (خرداد—تیر ۱۳۵۳) ، شمارهٔ مسلسل ۵۱ ، ص ۱۱۱-۱۵۰)

۴ - پرویز اذکایی : بیرونی از دیدگاه مردم شناسی
(هنر و مردم ، اردی بهشت ۲۵۳۶ ، ص ۳۳-۳۷)

۵ - دانش پژوه ، محمد تقی: الجواهر بیرونی و جواهر نامه های دیگر
(کارنامهٔ کنگرهٔ بیرونی ، ۱۳۵۲ش)

۶ - ———— : التسامح الدینی عندالبیرونی
(مجلهٔ دانشکده ادبیات و علوم انسانی ، شماره مسلسل ۸۹ (یاد استاد بدیع الزمان فروزانفر) شماره سال ۲۲ (بهار ۱۳۵۳) ، ص ۱۸۸-۱۹۷)

۷ - رضوی ، ا - ا : بیرونی ، نابغهٔ ذوالفنون یا لئوناردو داوینچی اسلام
(ہنر و مردم ، اردی بہشت و خرداد ۱۳۵۳ ،
ص ۳۳-۳۸)

۸ - ریتر ، پلموت : ترجمهٔ ابو ریحان بیرونی از کتاب پاتانجل
در : معارف اسلامی (تہران) ، ۱۱ (خرداد ۱۳۴۹) ،
ص ۲۷-۳۱ ، عربی متن ، ص ۳۰-۳۱)

۹ - سیاقی ، محمد دبیر : مشتی از خروار ، دفتر دوم ، تہران ۱۳۴۵ ، ص ۲۵ ببعد -

۱۰ - صفا ، ذبیح الله : تاریخ علوم عقلی در تمدن اسلامی تا اواسط قرن پنجم
مجلد اول ، چاپ دوم ،
تہران ۱۳۳۶ ، ص ۲۸۱-۲۸۷

۱۱ - قربانی ، ابولقاسم : عدم اعتقاد ابو ریحان بیرونی و احکام نجوم
(ہنر و مردم ، آذر ماه ۱۳۵۲ ، ص ۳۷-۳۸)

۱۲ - مہدی محقق، دکتر: دو نسخه کہن از ''تفہیم'' بیرونی متعلق به کتابخانه
موسسه شرقشناسی کاما ، بمبے
(ہنر و مردم ، آبان ۱۳۵۲ ، ص ۱۹-۳۰ مع
۲۰ تصاویر)

۱۳ - مہوش شاہق : استادان ابو ریحان بیرونی و آثار شان
(ہنر و مردم ، تیرو مرداد ۱۳۵۲ ، ص ۳۵-۳۹)

۱۴ - ترجمه دو فصل از کتاب تحقیق ماللهند بیرونی از غلام رضا اعوانی
(جاویدان خرد ، ج ۲ ش ۱ (۲۵۳۵/۱۹۷۶) ص ۶۳-۷۹)

پاکستان

1. Khalid Mahmood : Al-Biruni was a Pakistani.
(The Pakistan Times = PT (Lahore), Sunday, Dec. 2, 1973)

2. Al-Biruni Congress in City from tomorrow. By a Staff Reporter.
(PT, Thursday, Dec. 6, 73)

3. Biruni : Scientist and Scholar extraordinary.
   (PT, Friday, Dec. 7, 73)
   سید حسین نصر کے ایک مقالے سے اقتباس

4. Kutchery Road renamed after Al-Biruni.
   (PT. Dec. 7, 73)
   بیروت کے ڈاکٹر ہشام (ڈائریکٹر المقاصد الاسلامیہ)
   نے افتتاحی رسم ادا کی تھی ۔

5. Student rumpus. Al-Biruni function called off. By a Staff Reporter.
   (PT, Saturday, Dec. 8, 73)
   ہزارۂ بیرونی کے پہلے اجلاس (نیو کیمپس) میں طلباء
   کی ہنگامہ آرائی پر تفصیلی رپورٹ

6. Al-Biruni. By Ghulam Mohammad (Rawalpindi).
   (PT, Sunday, Dec. 9, 73, Letter to the Editor)
   اس مکتوب میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ننده ،
   جہاں بیرونی نے زمین کی پیائش کا حساب لگایا تھا ،
   کے تباہ شدہ قلعہ اور مسجد کی حفاظت کی جائے
   اور ان عمارتوں کے ساتھ ایک کتاب خانہ ، مرکز
   نوادرات اور رصدگاہ بھی تعمیر کی جائے۔

7. Al-Biruni. By Abdul Hameed.
   (PT, Dec. 9, 73. Letter to the Editor)
   خالد محمود کے متذکرۂ بالا مضمون (۲ دسمبر) پر
   اظہار رائے

8. Azim Kidwai ; Al-Biruni and the Slowing Glohe.
   (PT, Dec. 9, 73. Magazine Section)

9. Al-Biruni discovered that earth is round. By a Staff Reporter.
   (PT, Dec. 9, 73)

10. Tributes paid to Al-Biruni. By a Staff Reporter.
    (PT, Monday, Dec. 10, 73)

11. Sher Muhammad Garewal : Al-Biruni.
    (PT, Thursday, Dec. 13, 73)
    خالد محمود کے محولہ بالا مضمون (۲ دسمبر) سے اختلاف
    کیا گیا ہے -

12. Muslims Should produce another Al-Biruni.
    (Dawn (Karachi), Dec. 2, 1973)
    پشاور میں گورنر صوبہ سرحد محمد اسلم خان خٹک
    کی افتتاحی تقریر، جو البیرونی کانفرنس کے پہلے اجلاس
    میں کی گئی تھی -

13. M. Aminuddin : Al-Biruni, a great Muslim Scientist.
    (Ibid., Nov. 26, 73)

14. Begum Liaquat opens A-Biruni Congress today.
    (Ibid., Nov. 26, 73)

15. 'Pakistan keen to rediscover Al-Biruni for the World'. By a Staff Reporter
    (Ibid., Nov. 27, 73)
    گورنر سندھ بیگم لیاقت علی خان ، قدرت اللہ شہاب
    اور حکیم محمد سعید کی تقاریر سے اقتباسات -

16. Scholars discuss philosophical views of Al-Biruni. By a Staff Reporter.
    (Ibid , Nov. 29, 73)
    کراچی میں البیرونی کانگرس کے اجلاس ، منعقدہ
    حبیب پلازا ، چندریگر روڈ (فلور نمبر ۲۲ و ۲۳)
    کی روداد -

17 - ابو ریحان البیرونی — ایک عظیم دانشمند اور محقق - تحریر سید حسین نصر
(روزنامہ 'جنگ' (کراچی) ، ۲۶ نومبر ۱۹۷۳ء ، خصوصی اشاعت)
پہلے صفحہ پر البیرونی کی تصویر اور لندن کی تین تصاویر شائع کی
گئی ہیں -

18 - البیرونی عالمی کانگریس -
(ایضاً ، ۲۶ نومبر ، ۱۹۷۳ء)

19 - غلام ربانی عزیز : البیرونی اور اس کی علمی فتوحات
(ایضاً ، ۲۶ نومبر ۱۹۷۳ء)

20 - حکیم محمد سعید : البیرونی کی کتاب الصیدنہ (ایضاً ، ۲۸ نومبر ، ۷۳ء)

21 - شیخ محمد علی : ابو ریحان البیرونی (ایضاً ، ۲۶ نومبر ، ۷۳ء)

22 - جمیل صدیقی : البیرونی کون تھا ؟ (ایضاً ، ۲۷ نومبر ، ۷۳ء)

23 - اختر الاسلام صدیقی: البیرونی کی ہزارویں سالگرہ پر پاکستان کے نئے ٹکٹ
(روز نامہ "مشرق" (لاہور) ، ۹ دسمبر ، ۷۳ء)
حکومت پاکستان نے البیرونی کانگرس کے موقع پر ۲۰ پیسے اور ایک روپیہ
پچیس پیسے کے یادگاری ٹکٹ شائع کیے تھے -

24 - عظیم قدوائی : البیرونی کی ہزار سالہ یاد ، البیرونی کی جغرافیائی تحقیقات سے
آج کے سائنسدان فائدہ اٹھا رہے ہیں (ایضاً ، ۷ دسمبر ، ۷۳ء)

25 - طلباء کے ہنگامے کی وجہ سے سہ روزہ بین الاقوامی کانگرس منسوخ کر دی
گئی - گورنر پنجاب افتتاحی تقریر کے بغیر یونیورسٹی سے چلے گئے -
(ایضاً ، ۸ دسمبر ، ۷۳ء - نیز اسی تاریخ کے دیگر اخبارات مثلاً امروز
(لاہور) ، نوائے وقت (لاہور) -

26 - البیرونی کو خراج عقیدت ادا کیا گیا (ایضا ، ۹ دسمبر ، ۷۳ء)

27 - ایک خطبہ٭ استقبالیہ جو پڑھا نہ جا سکا ، البیرونی پنجاب یونیورسٹی میں
(ایضاً ، ۱۰ دسمبر ، ۷۳ء - لاہور نامہ از انتظار حسین)

28 - جہاں پیا البیرونی کے لیے کچہری روڈ ، البیرونی کی شام ہمدرد
(ایضاً ، ۸ دسمبر ، ۷۳ء - لاہور نامہ از انتظار حسین)

29 - وارث میر : "کتاب الهند" بر صغیر کے علوم و معاشرت کی عدیم المثال
تاریخ ہے (ایضاً ، سنڈے ایڈیشن ، ۱۶ دسمبر ، ۷۳ء)

30 - البیرونی کو ایک ہزار سال بعد نئی زندگی ملی ہے
(ایضاً ، سنڈے ایڈیشن ، ۱۶ دسمبر ، ۷۳ء - افکار و حوادث از
ڈاکٹر عبدالسلام خورشید)

31 - ڈاکٹر محمد باقر : البیرونی لاہور میں (روزنامہ ”نوائے وقت“ (لاہور) ، ۱۳ دسمبر ، ۷۳ء)
یہ اقتباس اس مقالے کا حصہ ہے ، جو ڈاکٹر موصوف نے ہزارۂ بیرونی کے ایک اجلاس (۸ دسمبر) میں پڑھا تھا ۔

32 - کچھ باتیں علم والوں کی اور قلم والوں کی (روزنامہ ”جنگ“ (کراچی) ، ۲ دسمبر ، ۷۳ء ۔ دخل در معقولات از ابن انشاء مرحوم)

33 - محمد عثمان : البیرونی اور ہندو ذہن (روزنامہ ”امروز“ (لاہور) ، ۳ دسمبر ، ۱۹۷۳ء)

34 - ندیم احسن : لاہور البیرونی کی نظر میں (ایضاً ، ۱۰ دسمبر ، ۷۳ء)

35 - وارث میر : ”کتاب الہند“ کا طریق تحقیق انتہائی سائنٹیفک ہے (ایضاً ، ۱۶ دسمبر ، ۷۳ء)

36 - اشرف حسینی : ابو ریحان البیرونی (المعارف (لاہور) ، اگست ۱۹۷۶ء ، ص ۵۳ - ۵۸)

37 - بدر ، سید محمد مرتضٰی علی : البیرونی جو گزر گیا (العلم (کراچی) ، اکتوبر ۱۹۷۵ء ، ص ۱۰۷ - ۱۱۱)

38 - سالک، محمد علم الدین : علامہ ابو ریحان البیرونی (نگارشات (مجموعۂ مقالات)، مرتبہ گیتی آراء سالک ، لاہور ، ۱۹۷۵ ء ، ص ۲۳۹-۲۴۷)

39 - مسلیم الرحمٰن ، محمد : البیرونی (قومی صحت (لاہور) ، دسمبر ۱۹۷۵ء ، ص ۲۱ - ۲۳)

40 - مولانا شبلی : مکتوبات شبلی بنام مولوی عبد الحق ، بتاریخ ۲۰ جنوری ۱۹۰۵ء بحوالہ نقوش، مکاتیب نمبر ، جلد اول (نومبر ۱۹۵۷ء) ، ص ۱۷۸ - اس مکتوب میں البیرونی کے متعلق بعض مفید معلومات درج ہیں ۔

41 - صابر آفاقی ، ڈاکٹر : البیرونی اور کشمیر (المعارف ، ۱۹۷۳ع)

42 - علی ، شیخ محمد : البیرونی اور جدید خلائی تحقیقات (العلم ، جولائی ۱۹۷۶ع ، ص ۲۱۹-۲۳۳)

43 - عمر ، پروفیسر محمد : البیرونی اور جدید خلائی تحقیقات (العلم ، اپریل تا جون ۱۹۷۶ع)

44 - غلام ربانی عزیز : البیرونی کے علمی کارنامے (صدف (کراچی) ، اپریل ۱۹۷۶ع ، ص ۳۳-۳۸)

45 - تسبیحی ، محمد حسین : فارسی پاکستانی و مطالب پاکستان شناسی ، جلد دوم، اسلام آباد ۱۹۷۷ع ، ص ۱-۱۶ (تصانیف بیرونی کا اجالی تذکرہ)

46 - ڈاکٹر ضیاؤالدین (علی گڑھ) کا مکتوب بنام ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ، جس کا ایک اقتباس علامہ نے اپنی ایک تحریر میں درج کیا ہے ، رک :

Thoughts and Reflections of Iqbal. Ed. Syed Abdul Vahid, Lahore 1964, pp. 150—1

46. Kemal M Habib : Evaluation of al-Biruni's Kitab al-Saydanah (VI. 23 (1975) pp. 238—41, 284—94)

افغانستان

(1) - ابو ریحان البیرونی - مجموعہ مقالات ، پیامهاوراپورتهائی د افغانستان جمهوری دولت ،

د افغانستان اکادیمی د پشتوانکشاف او تقوی ریاست، کابل ، ۱۳۵۲/۱۹۷۳ع

انگریزی عنوان :

Reports on Al-Beruni : Afgbanistan's Great Scholar on bis millennium at the Kabul Seminar. Publisbed by the Ministry of Information and Culture, Republic of Afgbanistan. 194 + 7 p. in English.

اس کتاب میں مندرجہ ذیل مقالات کو شامل کیا گیا ہے :

1 - خلیل اللہ خلیلی : مقام اخلاق انسان در نظر البیرونی ، ص ۱-۱۷

2 - عبدالحئی حبیبی : آیا البیرونی خراسانیست یا خوارزمی؟ ، ص ۱۸-۲۶

3 - دکتور میکائیل بوگولیوف : طبع و تحقیق آثار علمی ابو ریحان در اتحاد شوروی ، ص ۲۷-۳۵

4 - دوکتور مهدی محقق : رساله ابو ریحان در فهرست کتابهای رازی ، ص ۳۶-۴۵

5 - عبدالرؤف بینوا : د علامه البیرونی عصر او اجتماعی محیط (پشتو) ، ص ۳۶-۵۵

6 - دکتور محمد انس : ریاضیات و نجوم البیرونی ، ص ۵۵- ۶۹

7 - محمد اسماعیل مبلغ : سیمای فلسفی البیرونی ، ص ۷۰-۸۸

8 - داکتر حسین علی محفوظ : کتاب الجماهر آئینه عقائد و افکار و روش علمی بیرونی ، ص ۸۹-۹۰

9 - غوث خیبری : علامه البیرونی د هند داو سنو پوهانو په نظر کی (پشتو) ، ص ۹۱-۱۰۵

10 - دکتر جعفر شهیدی : داستان سوختن کتابخانه خوارزم در آثار البیرونی ، ص ۱۰۶-۱۱۲

11 - غلام سرور همایون : البیرونی و خیشخانه هرات ، ص ۱۱۳-۱۲۱

12 - صدیق الله رشتین : د البیرونی ژب پوهنه (پشتو) ، ص ۱۲۲-۱۲۹

13 - احمد حسن دانی : البیرونی و شهر لاهور ، ص ۱۳۰ - ۱۳۸

14 - غلام جیلانی جلالی : شرح حال البیرونی ، ص ۱۳۹-۱۵۳

15 - کارهای نجومی البیرونی ، ص ۱۵۳-۱۶۰

16 - مقبول احمد : سهم البیرونی در مطالعات جغرافیائی و عوامل انحطاط علوم بعداز البیرونی ، ص ۱۶۱-۱۶۳

17 - حسین علی محفوظ : الجماهر ، د البیرونی د افکار و اوعقاید و آئینه (پشتو) ، ص ۱۶۳-۱۶۸

18 - مایل هروی : افسانهٔ بوریحان (منظوم) ، ص ۱۶۹-۱۷۲
د پیغامو لو برخه ، ص ۱۷۳-۱۸۵
د البیرونی د جشن د علمی غوندو دوروستی رپوت متن (پشتو) ، ص ۱۸۶-۱۹۰
راپورتهای جلسات علمی جشن البیرونی که از تاریخ ۲۶ الی ۳۱ جوزا [۱۶-۲۱ جون ۱۹۷۳ع] دایر گردید ، ص ۱۹۱-۱۹۳

مقدمہ از غوث خیبری ، ص أ ـ ل
استاد جلالی : ابو ریحان بیرونی علامہ نامدار افغانستان ، بطور مقدمہ ،
ص أ ـ ح

Dr. Tadeusz Jarzebowski : Astronomical Works of Al-Beruni, pp. 1-7

(ب) ـ البیرونی جشن ـ د اطلاعاتو او کلتور وزارت ، کابل ۱۹۷۳ع

(ج) ـ د البیرونی جشن (پشتو) ـ د اطلاعاتو اوکلتور وزارت ، کابل ۱۹۷۳ع

(د) ـ غوث خیبری : البیرونی (پشتو) کابل ۱۹۷۳ع

(ه) ـ د البیرونی کتاب نبود ؟ ترجمہ کوونکی او بشپړوونکی عبدالحئ حبیبی ،
کابل ۱۹۷۳ع

(و) ـ صمد حسین رضوی : لسخہ واحد یک اثر نامعلوم ابو ریحان البیرونی ،
غرۃ الزیجات یا ترجمہ عرفی کرنہ تلکہ ، ترجمہ محمد یعقوب واحدی
(آریانا ، ج ۲۱ ، ش ۹ ، ص ۱ـ۵)

(ز) - The Millennium of the Birth of Al-Beruni. Essays by Afghan Scholars. Kabul, 1973.

(ح) - Al-Beruni's Thousandth Anniversary

اهدائیہ خلیل اللہ خلیلی ، کابل ۱۹۷۳ع

(ط) - G. Jalali : An Introduction to Beruni.
(Afghanistan, 27/1 (1974), pp. 62—6)

(ی) - Mir Hussain Shah · Beruni and his follower, Gardezi, on the festivals of the Hindus.
(Afghanistan, 26/3 (1973), pp. 90—4)

وزارت اطلاعات و کلتور حکومت جمہوری افغانستان کی جالب سے ہزارہ بیرونی کے سلسلے میں کابل میں جو جشن منایا گیا وہ ۲۶ تا ۳۱ جوزا (مطابق ۱۶ ـ ۲۱ جون ، ۱۹۷۳ع) جاری رہا ـ مباحثات علمی کا پہلا اجلاس ۲۷ جوزا بروز یک شنبہ ۹ بجے صبح کتاب خانہ پوهنتون کابل کے ہال میں منعقد ہوا ، جس میں عبدالحئی حبیبی کو حیثیت رئیس جلسات ، ڈاکٹر سید بہاؤالدین مجروح کو عضویئات افغانستان اور بھارت کے ڈاکٹر سید مقبول احمد کو منشی ہای مجلس منتخب کیا گیا ـ تمام ملکی اور غیر ملکی دانشمندوں نے انہی اجلاسوں میں اپنے مقالات پڑھے ـ ان میں سے بعض مقالات کے حوالے سطور بالا میں درج ہیں ـ

ان اجلاسوں کی کارروائی اور منظور شدہ قراردادوں کی تفصیل درج ہے :

1 - جشن بیرونی میں شامل ہونے والے دانشمندان گرامی نے اپنے عالمانہ مقالات میں بیرونی کی زندگی اور آثار و افکار کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور قیمتی معلومات فراہم کیں - نیز آئندہ کے لیے مطالعات بیرونی شناسی کے امکانات کا جائزہ لیا -

2 - شہر غزنی میں ، جسے بیرونی کی فکری پرورش گاہ اور آرام گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے ، بیرونی کے نام پر ایک سڑک تعمیر ہوئی اور اس پر نصب شدہ "لوح البیرونی" کی نقاب کشائی کی رسم ادا کی گئی - علاوہ ازیں بیرونی کی تصنیفات کے خطی نسخوں پر مشتمل ایک کتاب خانے کا افتتاح ہوا - افغانی ، غیر ملکی اور غزنی کے دانشمندوں نے اظہار عقیدت کے طور پر بیرونی کی قبر پر پھول چڑھائے اور اپنے تاثرات کا اظہار کیا -

3 - تمام زبانوں میں موصول ہونے والے بیانات کے متن کو ایک مجموعہ میں طبع کیا جائے -

4 - بیرونی کے نام پر ایک پولی ٹیکنک آڈیٹوریم ، مدرسہ اور سڑک کی تعمیر کی جائے تاکہ اس کا نام شاگردانِ مدارس اور عوام میں زندہ رہے -

5 - پوھنتون کابل و انجمن تاریخ و ادب افغانستان اکادمی "مرکز مطالعات البیرونی" کے نام سے ایک ادارے کا سنگ بنیاد رکھے اور اس میں بیرونی کے قلمی اور مطبوعہ آثار اور اس کے متعلق مختلف زبانوں میں شائع ہونے والے مقالات کو یکجا کیا جائے تاکہ جوکوئی بیرونی پر تحقیق کرنا چاہے ، اسے اصل منابع تک رسائی حاصل کرنے میں دشواری نہ ہو - اس مرکز میں بیرونی کے متعلق ان کتابوں اور مقالوں کا ترجمہ کیا جائے جو یورپی زبانوں میں شائع ہوئے - اسی طرح جو کتابیں اور مقالے افغانستان میں شائع ہوں ، ان کو یورپی زبانوں میں منتقل کیا جائے - اس کام کے لیے یونیسکو کا تعاون حاصل کیا جائے -

اس مرکز میں بیرونی سے متعلق مختلف علمی موضوعات پر سادہ اور عام فہم انداز میں کتابیں لکھوائی جائیں تاکہ محققین اور محصلین ان سے بآسانی استفادہ کر سکیں - اس مرکز میں بیرونی سے متعلق دنیا میں تمام علمی سرگرمیوں سے آگہی کا بندوبست کیا جائے -

6 - اگر ممکن ہو تو وزارت معارف غزنی میں بیرونی کے نام پر ایک کالج تعمیر کرائے۔

7 - بیرونی کے بارے میں پشتو مقالات کو مرتب کیا جائے اور غزنی میوزیم کو وسیع کرنے کی جانب توجہ دی جائے ۔

8 - بیرونی کے مزار کو افغانستان کے تاریخی فن تعمیر کے مطابق بنوایا جائے اور اس کی مناسب نگہداشت کی جائے۔

9 - پوہنتون کابل میں تاریخ علوم کے کورس کی بنیاد رکھی جائے اور اصحاب علم و دانش کو گذشتہ دانشمندوں کے افکار علمی سے واقفیت پیدا کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں - نیز قدیم و جدید مبانی علم میں مطابقت پیدا کی جائے۔

10 - یونیسکو سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ ایک خصوصی بین المللی انجمن کی بنیاد رکھنے میں اعانت کرے تاکہ اس کے ذریعے بیرونی کے آثار علمی کے ترجمہ ، تحقیق اور طباعت کا انتظام کیا جا سکے ۔

11 - افغانستان کے وہ دانشمند جو دیگر ممالک میں بیرونی پر کام کر چکے ہیں ، ان کے ساتھ معاونت کی جائے۔

بھارت

1. Ali, S. M. : Arab Geography. Aligarh, 196J, pp. 80—7

2. Hasan Askari Kazmi : Al-Biruni's longitudes and their conversion into modern values. (IC, 49 (1975), pp. 165—76)

3. Mahdi Gharavi, S. : Two noteworthly manuscripts of Al-Biruni's al-Tafhim. (IC, 49 (1975), pp. 215—9)

4. Subbarayappa, B.V. : Symposium on al-Biruni and the Indian Sciences. (Indian Journal of History of Science, 7 (1972), pp. 75—7)

5. Yasin, Mobammad : Al-Biruni in India.
(IC, 49 (1975), pp: 207—13)

6 - محمد عمر الصدیق : ابو ریحان البیرونی (معارف (اعظم گڑھ) "بابت دسمبر ۱۹۷۷ع)

ایرانی زر تشتی انجمن (بمبئی) اور ایران لیگ (بمبئی) نے ۱۵ ستمبر ۱۹۷۳ع (بروز ہفتہ) کو K. R. Cama Oriental Institute (بمبئی) کے لائبریری ہال میں ہزارہ بیرونی کے سلسلہ میں ایک تقریب منعقد کی تھی -

متفرقات

۱ - Max Krause (م - ۱۸ فروری ۱۹۴۴ع)

ماکس کراوزے کا تعلق دانشگاہ ہامبورگ سے تھا - ان کا شمار اس صدی کے صف اول کے جرمن مستشرقین میں ہوتا ہے - ان کی زندگی اور علمی کارناموں پر Albert Dietrich نے ایک مضمون لکھا تھا ، رک :

Der Islam, 29/1 (1949), pp. 104—8

اس مضمون کے ص ۱۰٦ پر کراوزے کی بیرونی کے متعلق علمی خدمات کو سراہا گیا ہے - "آثار البیرونی" میں ان کی چند تحریروں کے حوالے درج ہیں (ص ٦۷) وغیرہ ، لیکن اس ضمن میں ان کی مندرجہ ذیل کتابیں اور تبصرے بھی مفید معلومات کے حامل ہیں :

a) Stambuler Handschriften islamischer Matbematiker.
Berlin, 1938.

b) Rewiew on : Max Meyerbof's Das Vorwort zur Drogenkunde des Beruni. Berlin, 1932. In : Der Islam, 22 (1935), pp. 266—9.

c) Review on : Serefeddin Yaltkaya's Birunlu Ebu Reyban مقدمہ کتاب الصیدنہ فی الطب Kitabussaydele fittıb mukaddımesi.
Istanbul, 1937. In : Der Islam, 25 (1939), pp. 194—6.

2 - Fritz Krenkow (۱۸۷۲ع — ۱۹۵۳ع)

کرینکو بھی جرمن مستشرق تھا اور اس نے البیرونی پر خاصا تحقیقی کام کیا ہے ۔ ''آثار البیرونی'' میں اس کی کتابوں اور مقالوں کے حوالے جا بجا درج ہیں ۔ Otto Spies نے اس کے سوانح حیات اور علمی خدمات پر ایک تفصیلی مضمون لکھا تھا ، رک :

Der Islam. 31/2—3 (1953). pp. 228—36

3 - Eilhard Wiedemann کی فہرست کتب ومقالات از Hugo Seemann در :
Isis, 14 (1930), pp. 198—86

4 - Al-Biruni on Transits (رک : آثار البیرونی ص ۵۹) پر تبصرہ از Robert Boker در :
Der Islam, 37 (1961), pp. 278 - 85

5 - A Commentary upon Biruni's Kitab Tahdid (رک : آثار البیرونی ، ص ۵۹) پر تبصرہ از D. Pingree در :
JAOS, 96/1 (1976), p. 156

اسی کتاب پر ایک اور تبصرہ از Paul Kunitzsch در :
ZDMG, 127/1 (1977), pp. 134—6

6 - بیرونی کی جائے ولادت کاث کے لیے رک :

The World Atlas. Moscow, 1967, map 25—6, D 6, and 28—9, D 5 (Chief Administration of Geodesy and Cartography under the Council of Ministers of the USSR). ATLAS SSSR. Moscow, 1962, map 24—5, B 5; The Times Atlas of the World, Vol. 2, London, 1959, pl. 43, F. 6.

7 - ابوالریحان البیرونی - تألیف رشاد دارغوث ، مطبوعہ بیروت

8 - ابوالریحان البیرونی - تالیف محمد جمال‌الفندی و دکتور محمد ابراہیم احمد

9 - الصیدلة فی‌الطب ، نسخہ مخطوطہ کتاب خانہ فاکولتہ ادبیات بغداد ، بخط محمد بن ابراہیم تبریزی در سال ۶۷۸ھ از روی نسخہ بخط ظہیرالحق ابوالمحامد محمد بن مسعود بن محمد زکی غزنوی از روی نسخہ بخط خود بیرونی و شیخ احمد نہشعی ۔

10 ۔ بیرونی کی ایک کتاب "جدول السهام" (؟) کے دو ورق ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی ذاتی ملکیت ہیں ۔ انھوں نے "غرة الزیجاة" کے دیباچے میں اس کا ذکر کیا ہے ۔

11 ۔ منتخبات بیرونی ، ۳ جلد ، طبع ماسکو
جلد چہارم اور پنجم ہزارہ بیرونی منعقدہ تاشکند (ستمبر ۱۹۷۳ع) کے موقع پر شائع کی گئیں ۔

12 ۔ قانون مسعودی ۔ ترجمہ روسی و اوزبکی ، ۱۹۷۳ع

13 ۔ کتاب الصیدنہ ، روسی ترجمہ از پروفیسور کریموف ، ماسکو ۱۹۷۴ع

14 ۔ مقالہ فی النسب التی بین الفزات و الجواهر ، طبع خانیکوف ، لینن گراڈ ۱۹۷۲ع

15 ۔ کتاب التفہیم (قلمی) در شعبہ کتب د ستخطی انستیتوت سرشناسی اکادمی علوم تاجیکستان ، سنہ کتابت ۵۶۲۸/۱۲۳۱ع ۔
اس مخطوطے کا تنقیدی متن مع حواشی و تاجیکی ترجمہ شائع ہوگا ، مرتبہ محمد عظیموف

16 ۔ متن عربی مکاتبہ بیرونی با ابن سینا بہ ضمیمہ ترجمہ زبان اوزبکی بعنوان "بان بیرونی بلن ابن سینانیک سوال جوابلری" ۔
تاشکند ، ۱۹۵۰ع

17. Arzumetov, Yu. S. : Al-Biruni in the History of Medicine in Central Asia. (Sovetsk. Zdravooskh, 32 (1973), pp. 73—5. [CWHM 82, 147]

18. Mandelshtan, A.M. : K dannyn al-Biruni o Zakaspii. (Strany i narody Vostoka pod obshchey red. D.A. Ol'derogge, x, 1971, pp. 163—9)

19 ۔ مندرجہ ذیل روسی اور اوزبکی کتابوں میں مختلف علوم پر البیرونی کی گرانبہا خدمات کے متعلق تفصیلی بحث کی گئی ہے :
S. H. Sirazhdinov, G.P. Matvievskaia, A. Almedov (Mathematics and Astronomy); F. Zikrillaev (Physics); K. Narkhodzhaev (Geodesy).

فی الحال ان کتابوں کے بارے میں مکمل معلومات دستیاب نہیں ہو سکیں ۔

اختصارات

AS	=	Academy of Sciences (Akademia Nauk)
BS	=	Biruni Sbornik (Moscow/Leningrad, 1950)
ch.	=	chapter
ed.	=	edition, editor
IAI	=	Istoriko-astronomicheskie Issledovaniya
IMI	=	Istoriko-matematicheskie Issledovaniya
IP—IS	=	Izbrannye proizvedeniya; Izbrannye sochineniya [تصانیف منتخب]
JNES	=	Journal of Near Eastern Studies
KSINA	=	Kratkie Soobshcheniya Instituta narodov Azii.
LIU	=	"Literatura i Iskusstvo Uzbekistana"
M—L	=	Moscow/Leningrad
no.	=	number
ONU	=	Obschestvennye nauki v Uzbekistane
p.	=	page
pp.	=	pages
PS	=	Palestinsky Sbornik (1959)
pt.	=	part
RSO	=	Rivista degli studi orientali
Sec.	=	Section
TAS	=	Tajik Academy of Sciences
UZLGU	=	Ucbenye Zapiski Leningradskogo Gosudarstxennogo Universiteta
UzSSR	=	Uzbek Soviet Socialist Republic
vol.	=	volume
ZDMG	=	Zeitschrift der Deutschen Morgenlaendischen Gesellschaft

رک = رجوع کیجیے
ص = صفحہ ، صفحات

ڈاکٹر سلیم اختر

اردو تنقید پر انگریزی اثرات

اردو تنقید پر انگریزی اثرات کا مطالعہ دراصل پورے اردو ادب پر انگریزی اثرات کے مطالعے کے مترادف ہے ۔ ادبی تنقید زندگی عصر اور ادب سے منقطع کوئی آزاد اور خودکار عمل نہیں ہوتی ۔ شعور زیست کو بدلنے والے تاریخی ، سماجی یا تہذیبی عوامل تنقید پر بھی اسی طرح اثر انداز ہوتے ہیں جیسے دیگر تخلیقی اصناف ادب پر ۔ اس لیے کہ ادب و نقد کا بھی ویسا ہی اٹوٹ رشتہ ہے جیسا ادب اور عصر کا !

ادب و نقد پر انگریزی اثرات کی ابتدا کے لیے ۱۸۵۷ء کو بآسانی نقطۂ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس سال مغلیہ سلطنت باضابطہ طور پر ختم ہوئی اور ہندوستان ، تاج برطانیہ کے زیر نگین برطانوی مقبوضات میں شامل ہوا ۔ سر سید احمد خاں ، ان کی تحریک اور اس تحریک سے وابستہ بعض اصحاب جیسے حالی ، شبلی اور آزاد وغیرہ نے شعوری طور پر انگریزی اثرات قبول کرتے ہوئے انھیں اپنی فکر کی اساس قرار دینے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ان کا پرچار بھی کیا ۔ سر سید کی شخصیت اور تحریک نزاعی ہیں ۔ آج بھی اور صدی پیشتر بھی ۔ ہمیں اس موقع پر اس تحریک کے اغراض و مقاصد اور ان سے جنم لینے والے نزاعات سے غرض نہیں کہ یہ ہمارے موضوع کی حدود سے خارج ہیں لیکن اس امر پر یقیناً زور دیا جا سکتا ہے کہ سر سید کے زیر اثر اردو ادب میں نئی اصناف کی جو کونپلیں پھوٹیں ان کی آبیاری انگریزی خیالات سے کی گئی تھی ۔ جہاں تک تنقید کا تعلق ہے تو اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ گو "سر سید باضابطہ نقاد نہ تھے لیکن چونکہ کل قومی زندگی کے نقاد تھے اس لیے قدرتاً شعر و ادب کے سلسلے میں بھی انھوں نے خیالات کا اظہار کیا ۔ سر سید ۱۸۵۷ء تک محققانہ مورخانہ تصانیف میں منہمک رہے ۔ انقلاب کے بعد رفتہ رفتہ مغربی اثرات قبول کرتے گئے "[1] ۔ خود سر سید نے فیشن

---

۱ ۔ عبداللہ ڈاکٹر سید ۔ اشارات تنقید (طبع دوم) لاہور مکتبہ خیابان ادب ۱۹۷۲ء ص ۱۵۳ ۔

اور سٹیل کے انداز پر اردو میں مضمون نگاری کو فروغ دیا ۔

انگریزی زبان و ادب اور افکار و تصورات سے ہندوستان کی تہذیبی زندگی میں جو نئی لہریں ابھر رہی تھیں انھوں نے ادب کے ساتھ ساتھ تنقید کو بھی متاثر کیا ۔ چنانچہ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے الفاظ میں : "سماجی زندگی میں جو تغیرات ہوئے ان کے اثرات تنقید پر بھی پڑے اور اس نے بھی اپنے اندر ایک انقلابی کیفیت پیدا کی ۔"[۱] اس ضمن میں یہ واضح رہے کہ سر سید اور ان کے ساتھ ساتھ آزاد ، شبلی اور حالی نے مغربی خیالات سے استفادہ کی تلقین تو بہت زور و شور سے کی لیکن انگریزی زبان اور مغربی علوم سے ان کی کوئی ایسی خاص گہری واقفیت نہ تھی ۔ شبلی نے تو پھر بھی کچھ مطالعہ کر رکھا تھا لیکن آزاد[۲] اور حالی انگریزی سے تقریباً نابلد ہی تھے نتیجے میں تراجم کے ذریعے یا انگریزی داں حضرات کے وسیلے سے وہ جو کچھ جان سکے اسی کو انھوں نے سب کچھ جانا ۔ لطیفہ یہ ہے کہ "پیروی مغربی" میں یہی دونوں حضرات زیادہ پرجوش تھے ۔ لیکن اس نقطۂ نظر سے انہی پر ، آنے والے ناقدین نے زیادہ اعتراضات کیے ۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید محمودالحسن رضوی کی یہ رائے بھی قابل اظہار ہے :

"ان نقادوں نے جہاں ایک طرف اردو کو نئے تنقیدی گوشوں سے روشناس کرایا تنقید کے نئے معیار قائم کیے وہاں اس بات کی طرف بھی سب سے پہلے انہی نقادوں نے اشارہ کیا کہ انسانی زندگی کی نفسیاتی کیفیات شعرا اور ادباء کے ذہنوں کو کس طرح متاثر کرتی ہیں ۔"[۳]

جہاں تک انگریزی علم و نقد کی رہنمائی میں آزاد ، حالی اور شبلی کی تنقیدی کاوشوں کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں احتشام حسین نے بالکل درست لکھا ہے کہ : "سوا معمولی اشاروں کے کہیں بھی یہ شعرا کے خیالات کی بنیادوں یا شعور کے چشموں تک نہ پہنچ سکے اور نہ اسے واضح شکل میں زندگی کے میلانات سے متعلق کر سکے ۔ تجزیہ کی یہ کمی ان علوم سے واقفیت یا سطحی

---

۱ ۔ اردو تنقید کا ارتقاء ۔ ص ۱۳۶ ۔

۲ ۔ بقول آزاد :

"اے جوہر زبان کے پرکھنے والو ! میں زبان انگریزی میں بالکل بے زبان ہوں اور اس ناکامی کا مجھے بہت افسوس ہے ۔" ("نیرنگ خیال دیباچہ ص ۱۰) ۔

۳ ۔ اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر ص ۱۷۵ ۔

واقفیت کی غمازی کرتی ہے ، تنقید میں جن کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ نفسیات یا دوسرے سماجی علوم سے واقف تھے یا نہیں اسی وجہ سے ان کے یہاں گہرائی کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔''[1]

کلیم الدین احمد نے اس پیروی مغربی کے سلسلے میں اس خیال کا اظہار کیا ہے :

''آزاد اور حالی نے مغربی ادب سے استفادہ کرنے کا مشورہ پیش کیا تھا اور اس مشورہ پر عمل کرنے کی کوشش بھی کی تھی ۔ جس احساس نے آزاد اور حالی کو سرگرم عمل بنایا تھا وہ ان کے بعد بھی کارفرما رہا ۔ ۔ ۔ اردو میں پیروی مغربی عام ہوئی ، نئے لکھنے والوں کو مغربی ادب اور اصول تنقید تک رسائی تو ہوئی لیکن نتیجہ اچھا نہیں ہوا۔''[2]

گو کلیم الدین احمد نے پیروی مغربی کی مذمت کرتے ہوئے ایسے ناقدین کے بارے میں یہ لکھا کہ ''وہ غول بیابان کی طرح بھٹکتے رہے اور دوسروں کی ہلاکت کا سبب ہوئے۔''[3] لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو تنقید مغربی اثرات سے کبھی بھی آزاد نہ ہو سکی ۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کی صورت میں اردو تنقید کی اصولی بحثوں کے خمیر میں انگریزی خیالات یوں شامل ہو گئے کہ آنے والے ناقدین مخالف یا موافقت کی صورت میں ان خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے[4] دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے ناقدین کی اکثریت انگریزی سے بے بہرہ نہ رہی جس کے نتیجے میں انھوں نے اپنے مغربی مطالعات کے ثمرات سے اردو تنقید کے دامن میں بہت کچھ ڈالا ۔ چنانچہ احتشام حسین نے اپنے مبسوط مقالے ، اردو تنقید کا ارتقاء میں ۱۹۳۶ء تک کے تنقیدی ارتقا کے ضمن میں مغربی اثرات سے بحث کرتے ہوئے لکھا :

''مغربی اثرات مختلف شکلوں میں جذب ہونے لگے ۔ کہیں جوں کے توں اگل دیے گئے کہیں ہضم ہو کر نقاد کے خون میں شامل ہو گئے۔''[5]

---

۱ ۔ ذوق ادب اور شعور ص ٦٦ ۔
۲ ۔ اردو تنقید پر ایک نظر ۔ ص ۱۳۸ ، ۱۳۹ ۔
۳ ۔ ایضاً ص ۱۳۹ ۔
۴ ۔ ملاحظہ ہو میر خورشید علی خاور کا مقالہ اردو ادب نے مغربی زبانوں سے کیا فائدہ اٹھایا مطبوعہ عالمگیر لاہور فروری ۱۹۳۳ء ۔
۵ ۔ ذوق ادب اور شعور ص ٦٧ ۔

اس انداز کی اولین اور بہت نمایاں مثال کے طور پر عبد الرحمٰن بجنوری کی کتاب محاسن کلام غالب پیش کی جا سکتی ہے ۔ اور ان کے بعد تو آنے والے ناقدین میں سے شاید ہی کوئی ایسا قابل ذکر نقاد ملے جس کی تنقید انگریزی اثرات سے کلیتاً پاک ہو ۔ حتیٰ کہ محمد حسن عسکری کی صورت میں تو فرانسیسی ناقدین کا تذکرہ بھی اردو تنقید میں شروع ہو گیا ۔

جہاں تک ادب و نقد میں انگریزی افکار و تصورات کے فروغ کا تعلق ہے تو حالی اور شبلی کے مقابلے میں محمد حسین آزاد ایک پرجوش مبلغ کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں ۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ایک مضمون اردو انگریزی انشا پردازی پر کچھ خیالات میں واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیا :

" - - - اور تمھاری انشا پردازی کا یہ حال ہو گیا ہے کہ غیر قومیں تو جو کچھ کہیں بجا ہے میں خود دیکھتا ہوں اور شرماتا ہوں کیونکہ مستعمل چیز میں شگفتگی اور تازگی دکھانی بہت مشکل ہے - پھر بھی خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ ایک خزانہ مصوری کا تمھارے ہاتھ آ گیا ہے مگر اتنا ہے کہ وہ انگریزی قفلوں میں بند ہے جس کی کنجی انگریزی زبان ہے ـــــ"[1]

اسی مضمون میں ایک اور موقع پر بھی انھوں نے اسی خیال کا اظہار کیا :

"خلاصہ" مطلب یہ ہے کہ اگر ہمارے پہلے انداز پرانے اور مستعمل ہو گئے تو ہمیں چاہیے کہ انگریزی باغ میں سے نئے پودے لے کر اپنا گلزار سجائیں ۔"[2]

اور مضمون کے اختتام میں یہ تلقین کرتے ہیں کہ "اردو اور انگریزی زبانوں کے چقماق کے دونوں جزوں کو ٹکراؤ کہ آگ نکلے"[3] آزاد کی یہ خواہش ہے کہ اردو زبان پر انگریزی روغن چڑھا کر ایسا خوش رنگ کرو کہ انگریز کہیں ہندوستان میں شکسپیئر کی روح نے ظہور کیا ۔"[4]

اس مضمون کے علاوہ آزاد نے اپنے ایک لیکچر میں بھی انہی خیالات کا اظہار کیا :

---

۱ - محمد حسین آزاد نیرنگ خیال لاہور عشرت پبلشنگ ہاؤس ۱۹۶۴ع ص ۱۸ -
۲ - نیرنگ خیال - ص ۲۶ -
۳ - ایضاً ص ۲۳ -
۴ - ایضاً ص ۶۳ -

''تمھارے بزرگ اور تم ہمیشہ سے نئے انداز کے موجد رہے مگر انداز کے خلعت و نور جو آج کے مناسب حال ہیں وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں ۔ ہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے ۔'' ۱

گو آزاد نے انگریزی سے استفادہ پر بہت زور دیا لیکن خود ان کی اپنی تنقیدی کتب انگریزی اثرات سے عاری نظر آتی ہیں ۔ چنانچہ آب حیات ایک خالص مشرق ذہن کی غماز ہے اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کے الفاظ میں : ''مغرب سے انھوں نے اثر قبول کیا ہے لیکن مغربی تنقید سے وہ پوری طرح استفادہ نہیں کر سکے ہیں ۔ آزاد سے زیادہ تو حالی اور شبلی نے مغرب سے استفادہ کیا ہے ۔ آزاد تو کسی مغربی نقاد کا قول تک نقل نہیں کرتے ۔'' ۲

واضح رہے کہ خود آزاد نے یہ دعویٰ کیا ہے : ''میں نے انگریزی انشا پردازوں کے خیالات سے اکثر چراغ روشن کیا ہے ۔'' ۳

ویسے یہ حقیقت ہے کہ محمد حسین آزاد دوسروں کے لیے جو راہ ہموار کرتے ہیں خود اس پر چلنے سے معذور رہے ۔ شاید اس کی وجہ ان کا فارسی اور اردو شاعری کا مطالعہ ہو یا پھر ان کا مشرق ذہن ، جس شاعرانہ اسلوب اور مبالغہ و تخیل کا عادی تھا انگریزی انداز نقد میں ان کی گنجائش نہ نظر آتی ہو یا پھر یہ انگریزی آقاؤں۴ کی خوشنودیِ طبع کے لیے ہو کیونکہ لاہور میں وہ کرنل ہالرائڈ اور میجر فلر کے زیر اثر تھے بلکہ نیچرل شاعری کا تصور ہی کرنل ہالرائڈ کا تھا ۔ اس سے آزاد کی مذمت مقصود نہیں صرف یہ امر اجاگر کرنا ہے کہ اس عہد کے ادباء اور نقدین کا انگریزی زبان اور مغربی علوم کے بارے میں رویہ کچھ گو مگو کا سا معلوم ہوتا ہے ۔ لئے انکار کی کشش بھی تھی اور قدیم

---

۱ ۔ محمد حسین آزاد ۔ نظم آزاد ۔ لاہور مطبع کریمی ۱۹۲۶ء ص ۱۲ ۔

۲ ۔ اردو تنقید کا ارتقاء ۔ ص ۲۱۱ ۔

۳ ۔ نیرنگ خیال (دیباچہ) ص ۸ ۔

۴ ۔ اس ضمن میں محولا بالا لیکچر کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں :

''اگرچہ مدت سے عجیب اور اکثر اہل وطن کو اس کا خیال ہے مگر اب تقریر میں آنے کا باعث یہ ہے کہ دیکھتا ہوں آج کل ہماری گورنمنٹ اور ان اراکین کو اس طرف توجہ ہوئی ہے جن کے دل ہماری تعلیم کا ذمہ اٹھائے ہوئے ہیں حق پوچھو تو ہماری انشا کے ستارۂ اقبال کی مبارک ساعت ہے ۔'' (نظم آزاد ۔ ص ۱۵) ۔

روایات کا سحر بھی ۔ اور اسی تناظر میں الطاف حسین حالی اور ان کے مقدمہ شعر و شاعری کا مطالعہ کرنا چاہیے ۔

حالی اب آو پیروی مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

حالی کا یہ شعر ادب و نقد کے بارے میں ان کے اپنے تصور کے لیے ایک طرح سے موٹو کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے چنانچہ پیروی مغرب نے اچھی خاصی اصطلاح ایسی حیثیت اختیار کر لی ۔ یہی نہیں بلکہ بعد میں بعض ناقدین نے مقدمہ شعر و شاعری کا مطالعہ اس پیروی مغربی کی روشنی میں کرتے ہوئے اسے سراہا یا برعکس رائے کا اظہار کیا ۔

جہاں تک خود مقدمے کی اشاعت کا تعلق ہے تو ڈاکٹر عبد القیوم کے بقول دیوان کے ساتھ ''مقدمے کے ذریعے شاعری کی ماہیت پر بحث کرنے کا ۔ ۔ ۔ خیال مقدمہ کی اشاعت سے دس سال پیشتر ہی ان کے ذہن میں موجود تھا ۔''[1] اسی طرح انگریزی علوم سے استفادہ کے بھی وہ بڑی دیر سے قائل چلے آ رہے تھے ۔ چنانچہ ڈاکٹر عبد القیوم نے حالی کے بعض مکاتیب کی بنیاد پر اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ''اپنے خطوط میں مولانا نے قدیم شاعری کے انداز کو ناپسند کیا ہے اور مغربی خیالات کی طرف توجہ دلاتی ہے ۔''[2]

عام طور پر یہ باور کیا جاتا ہے کہ حالی نے لاہور کے چار سالہ دوران قیام پنجاب بک ڈپو کی ملازمت میں انگریزی کتب کے اردو تراجم کے مسودات کی تصحیح کرتے کرتے انگریزی افکار و تصورات سے واقفیت حاصل کی تھی ۔ لیکن ایسا کوئی ریکارڈ موجود نہیں جس سے انجمن کی کتب ترجمہ کی کتابیات مرتب ہو سکے ۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حالی نے صرف وہیں سے انگریزی خیالات اخذ کیے ویسے بھی ان دنوں ادب و نقد کے برعکس علمی سائنسی اور فنی مضامین یا پھر قصے کہانیوں کے تراجم ہو رہے تھے ۔ چنانچہ ڈاکٹر عبد القیوم کے الفاظ میں : '' ۔ ۔ ۔ یہ بات زیادہ صاف ہو جاتی ہے کہ حالی کی ذہنی تربیت میں ان تراجم کا کوئی نمایاں ہاتھ نہیں ہے بلکہ مختلف اثرات کے ذریعے یہ تبدیلی رونما ہوئی ہے ۔''[3] ویسے بھی بقول حالی ، حال یہ

۱ ۔ عبدالقیوم ڈاکٹر ۔ حالی کی اردو نثر نگاری لاہور مجلس ترقی ادب ۱۹۶۳ء ص ۳۳۳ ۔
۲ ۔ ایضاً ص ۳۳۶ ۔
۳ ۔ ایضاً ص ۱۸ء ۔

تھا کہ ''جدت پسند طبیعتوں پر جس قدر مغربی انشا پردازی کی لے اب تک کھلی تھی وہی ان کو لے اڑی ۔''[1] اور ان اڑنے والوں میں حالی غالباً سب سے زیادہ اہم اور ممتاز ہیں کہ اپنے مقدمہ شعر و شاعری کی صورت میں جدید تنقید کا سنگ بنیاد رکھا ۔ گو کلیم‌الدین احمد ایسے ناقدین نے حالی پر سخت اعتراضات کیے ہیں لیکن مقدمہ کی اہمیت کبھی ختم نہیں ہو سکتی ۔

مقدمہ شعر و شاعری کا تجزیاتی مطالعہ یا اس کے تحسین اس مقالہ کی حدود سے خارج ہے اس لیے موضوع کی رعایت سے اس امر کے تعین کی کوشش کی جاتی ہے کہ آخر حالی نے انگریزی اثرات کو کس طرح سے مقدمہ میں سمویا ۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے بھی اپنے مرتبہ مقدمہ شعر و شاعری میں یہ بحث چھیڑی ہے چنانچہ وہ بھی یہی سوال کرتے ہیں ۔ ''لیکن آخر وہ مغربی اثرات کیا تھے جن کے زیر اثر حالی نے نظام تنقید میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی؟ یہ تو طے شدہ ہے کہ حالی نے مغربی رنگ کو اپنانے کی کچھ زیادہ کوشش نہیں کی ۔ مغربی اثرات اخذ نہ کر سکنے اور اخذ کیے ہوئے خیالات کو ان کے اصل پس منظر میں نہ دیکھ سکنے کی بڑی وجہ حالی کی انگریزی سے ناواقفیت تھی ۔ شاید اس وجہ سے وہ نذیر احمد کی طرح اپنی تحریروں میں انگریزی الفاظ کی بھرمار سے پڑھنے والے کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔''[2]

اس مرعوب کرنے کی کوشش میں بعض اوقات حالی اپنی اچھی بھلی نثر کو بھونڈی بنا لیتے ہیں مثلاً انھوں نے ایک موقع پر لکھا ہے :

''(اگرچہ ایسا کلام جو دونوں کی سمجھ میں آ سکے) اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کو سادہ اور سہل کہا جائے (شیکسپئر کے ورکس پر شرحیں)۔''[3]

کیا اس عبارت میں لفظ سہل کی ضرورت ہے ؟

ڈاکٹر وحید قریشی نے حالی کے انگریزی خیالات سے استفادے کے ضمن میں ان امور کی طرف توجہ دلائی ہے : ''وہ خود انگریزی نہ جانتے تھے اور مختلف لوگوں سے وقتاً فوقتاً ترجمہ کرا کے اور مفہوم سن کر اسے اپنے تنقیدی نظام میں

---

۱ ۔ مجموعہ نظم حالی (دیباچہ) ص ۷ ۔
۲ ۔ وحید قریشی ڈاکٹر ۔ (مرتب) مقدمہ شعر و شاعری لاہور مکتبہ اردو ۱۹۵۳ء ص ۶۷ - ۶۸ ۔
۳ ۔ ایضاً

فٹ کرتے رہتے تھے اس لیے انھوں نے جن اقتباسات کو لیا ان کے سیاق و سباق سے الگ کر کے لیا بلکہ بعض جگہ انگریز مصنف نے کچھ اور کہا تھا انھوں نے کچھ اور سمجھ لیا ۔ ۔ ۔ ۔ انگریزی کی اعلٰی درجے کی کتابوں کے ساتھ ساتھ گھٹیا درجے کی کتابوں سے مواد حاصل کر کے حالی نے نہ صرف انگریزی تنقید کو اس کے صحیح تناظر میں نہیں دیکھا بلکہ اپنے تنقیدی نظام میں بھی انھوں نے بعض جگہ بے ڈھنگا پن پیدا کر لیا ہے جس کا اظہار مقدمہ کے پہلے ثلث میں بہت زیادہ ہے "[1] رہا یہ سوال کہ حالی نے کن انگریز ناقدین سے بطور خاص استفادہ کیا تو ڈاکٹر وحید قریشی کے بموجب: "مقدمہ شعر و شاعری میں میکالے اور ملٹن کا انھوں نے خود نام لیا ہے لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ملٹن کے فقرے کو انھوں نے دوسرے مصنفین کے یہاں دیکھا ہے یا پھر انھوں نے "Tractate of Education" کو ایسے لوگوں سے پڑھوایا ہے جو اس کے مفہوم کی تہہ تک نہیں پہنچ سکے ۔ ۔ ۔ البتہ میکالے کو انھوں نے خاصا دیکھا ہے اس کا اظہار تو ان کی دوسری تصانیف سے بھی ہوتا ہے لیکن یہ مطالعہ بھی اس کے دو مضامین "Milton" اور "Moor's Life of Lord Byron" ہی سے ماخوذ ہے اس کے علاوہ جانسن کی "Lives of Poets" کا پرتو بھی بہت جگہ پڑا ہے لیکن جتنا اثر میکالے کے نظریات کا ہے اتنا گہرا اثر جانسن کا نہیں اسی طرح معاصرین میں سے حالی کارلائل، بینتھم برک، گولڈ سمتھ[2] مل، کولرج، ورڈز ورتھ[3] اور میتھیو آرنلڈ وغیرہ کی تحریروں سے بھی ناواقف تھے[4] ڈاکٹر عبادت بریلوی کے حوالے سے ان ناموں میں مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے" جرمنی میں ہرڈر اور لیسنگ ۔ ۔ فرانس میں مادام ڈی سٹیل ۔ سینٹ بیو اور ٹین وغیرہ ۔[5]

ان امور کی طرف توجہ دلانے کا یہ مقصد نہیں کہ کلیم الدین احمد کے الفاظ میں حالی کے بارے میں یہ رائے مرتب کی جا سکے ۔

"خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی، غور و فکر ناکافی، تمیز ادنٰی ۔ دماغ و شخصیت اوسط ۔ یہ تھی حالی کی کائنات"۔[5] بلکہ ان ذہنی مشکلات کا احساس کرانا ہے جن کی بنا پر اس عہد کے

---

۱ ۔ مقدمہ شعر و شاعری (مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی) ص ۶۹، ۷۰ ۔

۲ تا ۳ ۔ مقدمہ شعر و شاعری (مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی) ص ۶۹، ۷۰ ۔

۴ اردو تنقید کا ارتقاء ص ۱۶۸، ۱۶۹ ۔

۵ ۔ اردو تنقد پر ایک نظر ۔ ص ۱۰۹ ۔

عظیم دانشور انگریزی اثرات اور مغربی افکار و تصورات کو اپنے خلوص یا لئے پن کے جوش میں ادھ کچے پکے طور پر تسلیم کر رہے تھے حالی نے غلط حوالے بھی دیے اور مغربی خیالات سے براہ راست واقفیت نہ ہونے کی بنا پر بعض اوقات ان کی تنقید مضحکہ خیز بھی بن جاتی ہے لیکن اس کے باوجود حالی کی اہمیت کم نہیں ہو سکتی چونکہ حالی اردو کے پہلے ناقد ہیں جنھوں نے انگریزی خیالات (غلط ہی سہی) پر اردو میں تنقید کی اصولی بحثوں کا آغاز ہی نہ کیا بلکہ ان کی روشنی میں اردو شاعری پر علمی تنقید بھی کی ۔ حالی کی صورت میں اردو تنقید کو ایک بنیاد مل گئی اور یوں اردو تنقید تذکروں کی دھندلی فضا سے باہر نکل کر ٹھوس زمین پر قدم جمانے کے قابل ہوگئی ۔ یہی نہیں بلکہ ایسے مباحث طے کرنے کے لیے چند اصول (ناکافی و تشنہ ہی سہی) اور ادبیات کی پرکھ کے لیے چند معیار بھی مل گئے ۔ بلکہ ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی کے بموجب تو ''حالی شعر و ادب کے لیے کسی جگہ بھی نفسیاتی کیفیات کے بغیر آگے بڑھنا مناسب نہیں سمجھتے''۔ چنانچہ جملہ اغلاط کے باوجود مقدمہ شعر و شاعری اس بنا پر اہم ہے کہ اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ طے کر دیا کہ اردو ناقدین کے لیے مغربی افکار و تصورات سے استفادہ ناگزیر ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آنے والے ناقدین نے حالی کی پیروی میں پیروی مغربی کو شعار بنایا اور اردو تنقید میں نفسیاتی ، مارکسی ، جمالیاتی ، رومانی اور تاثراتی تنقید ایسے تجربات کیے ۔

شبلی نے بھی اپنے دیگر نامور معاصرین ، حالی اور آزاد کی مانند انگریزی خیالات سے استفادہ کرتے ہوئے انھیں اپنی تحریروں میں سمونے کی کوشش کی ۔ شعرالعجم (پانچ جلدیں) اور موازنہ انیس و دبیر ان کی مشہور تنقیدی تالیفات ہیں ۔ ان میں سے شعرالعجم (جلد چہارم) میں شعر و شاعری سے وابستہ اصولی بحثیں ہیں ۔ جہاں تک شبلی کی عملی تنقید میں انگریزی اثرات کا تعلق ہے تو وہ شعرالعجم کی بقیہ جلدوں یا موازنہ انیس و دبیر میں برائے نام ہے۔ البتہ شعرالعجم کی چوتھی جلد میں انگریزی تنقید کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان انگریزی ناقدین سے استفادہ کیے بغیر ان تنقیدی مباحث سے انصاف نہ ہو سکا تھا ۔ شبلی کے تنقیدی شعور کی نشو و نما میں مغربی اثرات پر ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے ۔ ''انھوں نے مغربی ادبیات سے بھی دلچسپی لی اگرچہ ان کا یہ مطالعہ سطحی تھا لیکن پھر بھی اس

۱ ۔ اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر ۔ ص ۲۲۷ ۔

کی اہمیت ان کے ذہن نشین ہو گئی تھی ۔۔۔ مغربی ادبیات کے تنقیدی خیالات سے بھی انھوں نے دلچسپی لی کیونکہ ان کی تحریروں میں بعض غیر ممالک کے ادبیات کا ذکر کہیں کہیں ملتا ہے اور کہیں کہیں وہ مغربی مصنفین کے اقوال بھی نقل کرتے ہیں ۔۔۔ ان کے تنقیدی شعور کی نشو و نما میں مغربی ادبیات و تنقید کو بھی اچھا خاصا دخل ہے''[1] ویسے ایک بات ہے کہ اپنے دیگر معاصرین کی مانند شبلی کا بھی انگریزی کا مطالعہ بھی واجبی سا تھا ۔ یہ درست ہے کہ شبلی انگریزی سے قطعی طور سے نابلد نہ تھے لیکن اس کے باوجود وہ جس پایہ کے ناقد محقق اور مورخ تھے اس سطح کے انگریزی مطالعے سے محروم تھے چنانچہ شبلی نے شاعری کیا چیز ہے کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا ہے :

''انگریزی زبان میں نہایت اعالی درجے کی کتابیں اس مسئلے پر لکھی گئی ہیں جن میں سے بعض میری نظر سے بھی گزری ہیں گو میں ان سے اچھی طرح مستفید نہیں ہو سکا'' ۔

یہ تو ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ وہ انگریزی کتابوں سے اچھی طرح سے مستفید نہیں ہو سکے اور نہ ہو سکتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بھی مغربی خیالات سے سطحی و قفیت رکھتے ہیں اور یہ سطحیت ناگزیر تھی[2] یہ گرہ کلیم الدین احمد نے لگائی ہے ۔

آج یہ سطحیت ان ناقدین کا سب سے بڑا جرم بن جاتی ہے لیکن دیکھنا یہ چاہیے کہ مشرقی تعلیم اور شعر کی کلاسیکی روایات کے حصاروں میں مقید ہونے کے باوجود ان حضرات نے اپنے دیگر معاصرین کے مقابلے میں کہیں زیادہ بیدار مغزی اور مستقبل بینی بلکہ کسی حد تک تو باغی ہونے کا ثبوت دیا ۔ حالی اور شبلی دونوں نے مغربی ناقدین کے حوالوں کی روشنی میں تنقید کی نظریاتی بحثیں چھیڑیں اس لیے بعض امور میں ان دونوں کا تقابلی مطالعہ سود مند ثابت ہو سکتا ہے ۔ گو ان کی فکر اساسی لحاظ سے یکساں ہے لیکن اپنی اپنی شخصیت کے نفسی تقاضوں کی بنا پر دونوں میں اختلافات بھی نظر آتے ہیں اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی کی یہ رائے قابل غور ہے : ''شبلی اور حالی اپنے زمانے کے دو بڑے ادبی ڈکٹیٹر تھے انھوں نے قدیم و جدید (مغربی) تنقید کا مطالعہ کیا ۔ اس قدیم ڈھنچے کی حدود معین کرنے کے بعد مغربی تصورات کو اس کے خمیر میں سمونے

---

١ ۔ اردو تنقید کا ارتقاء ص ۱۸۳ ۔

٢ ۔ اردو تنقید پر ایک نظر ص ۱۱٦ ۔

کی کوشش کی ۔ اس میں شبلی اور حالی دونوں کا انداز یکساں ہے ۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں بعض تنقیدی اصطلاحوں کو صاف کرنے کی کوشش کی اور شبلی نے شعرالعجم اور موازنے میں ۔ بعض باتوں میں دونوں نے اتفاق کیا اور بعض میں اختلاف ۔ جیسا کہ دو آدمیوں میں مطالعہ کتب ماحول اور طبیعت کے فرق سے اختلاف ہونا چاہیے شبلی اور حالی میں بھی موجود ہے ۔ بعض معیار بعض تلازمہ ہائے خیال شبلی کو پسند تھے اور حالی کو ناپسند ۔ بعض حالی کو پسند تھے اور شبلی کے لیے نامطبوع ۔ اس پسند اور ناپسند کا اثر جہاں معائیر پر ہوا وہاں دونوں کی شاعری اور دونوں کی اصطلاحات کی تفسیر و تشریح پر بھی ہوا ۔ ان کا اپنا مزاج ان کے معائیر تنقید اور ان کی اصطلاحات کا مفہوم ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں ۔'' ۱

جہاں تک ان مغربی ناقدین کے اسماء کا تعلق ہے جن سے شبلی نے بطور خاص استفادہ کیا تو اس ضمن میں ڈاکٹر عبدالقیوم کے بموجب شبلی نے شعر کی تعریف جس طرح کی ہے : ہیزلٹ کے مضمون "On Poetry in General" میں بھی اسی طرح کے خیالات ملتے ہیں ۔ مولانا شبلی نے اپنے خیال کی وضاحت میں جان اسٹورٹ مل کے مضمون "Thoughts on Poetry its Varieties" سے استفادہ کیا ہے اور اس کے مضمون کے ابتدائی حصے کا ترجمہ پیش کیا ہے ۔'' ۲ شبلی کے یہاں ہنری لیوس کے خیالات بھی ملتے ہیں بلاشبہ یہ مصنفین حالی کے پسندیدہ مصنف میکالے سے زیادہ مستند ادبی حیثیت کے مالک ہیں ۔'' ۳ اسی طرح کچھ اور نام بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں ۔ در اصل اصل مسئلہ شبلی یا ان کے دیگر معاصرین کے مغربی ماخذات کا کھوج لگانا نہیں کہ اس کی حیثیت ادبی معلومات سے زیادہ نہیں بلکہ اصل مسئلہ پیروی مغربی کے رجحان کو اجاگر کرنے کا ہے ۔

حالی ، شبلی اور آزاد کی کوششوں سے اردو میں جس انداز نقد نے رواج پایا وہ آنے والے ناقدین کو کسی نہ کسی طور سے متاثر کرتا رہا چنانچہ اگر ایک طرف مہدی افادی ۔ امداد امام اثر اور وحید الدین سلیم کی صورت میں باضابطہ کتابیں لکھنے والے ناقدین ملتے ہیں تو دوسری طرف اس صدی کی ابتدا ہی سے ادبی جرائد میں ادبی تنقید پر ایسے مقالات نظر آ جاتے ہیں جن میں اردو ناقدین کو انگریزی خیالات سے استفادہ کی تلقین کرتے ہوئے نئے انداز نقد کی ترویج پر

---

۱ ۔ مقدمہ شعر و شاعری (مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی) ص ۵۳ ۔
۲ ۔ حالی کی نثر نگاری ص ۳۹۵ ۔
۳ ۔ ایضاً ص ۳۹۷ ۔

زور دیا گیا - اس سلسلے میں ان مقالات کا بطور خاص تذکرہ کیا جا سکتا ہے :

۱ - فن تنقید از سر عبد القادر مطبوعہ مخزن لاہور ستمبر ۱۹۰۱ء -

۲ - فن تنقید از میاں فضل حسین بی - اے مطبوعہ مخزن لاہور فروری ۱۹۰۲ء -

۳ - اردو میں فن تنقید کی ضرورت از سالک بٹالوی مطبوعہ تہذیب النسواں اکتوبر ۱۹۱۷ء آج کے نقاد کو شاید ایسے مقالات آثار قدیمہ لگیں لیکن یہ اور اس نوع کے دیگر مقالات کی اہمیت اس امر میں مضمر ہے کہ ان کی صورت میں اردو تنقید میں انگریزی اثرات ہولے ہولے کی صورت میں سرایت کرتے نظر آ سکتے ہیں -

موجودہ صدی کی ابتدا میں حالی ، شبلی اور آزاد کی بعد نمایاں ہونے والے ناقدین میں مہدی افادی ، امداد امام اثر اور وحید الدین سلیم کے نام نمایاں حیثیت رکھتے ہیں - ان میں سے مہدی افادی کے یہاں جمالیاتی اقدار کا لحاظ زیادہ ملتا ہے - مجنوں گورکھپوری نے مہدی اور والٹر پیٹر کے انداز نقد اور اسلوب کے سلسلے میں کئی مشابہتیں تلاش کی ہیں سو ان کے بقول :

''بحیثیت تنقید نگار کے بھی وہ بہت کچھ پیشتر ہی کی یاد دلاتے ہیں - پیٹر کا تنقیدی اسلوب محاکاتی یا ارتسامی ہوتا ہے جس کو ہیزلٹ اور لیمب کا ترکہ سمجھنا چاہیے افادی الاقتصادی کا انداز تنقید بھی یہی ہے - اردو میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے تنقید کو ادب لطیف بنایا - یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ پیٹر کی طرح انھوں نے بھی تنقید کو شاعری اور وہ بھی غزل کے مرتبہ کی چیز بنا دیا۔''[۱]

مہدی افادی نے کم لکھا - چنانچہ چند مقالات ''افادات مہدی'' کے نام سے ان کی موت کے بعد مرتب ہو کر طبع ہوئے تھے - اگر زندہ رہتے تو اپنے مخصوص انداز نقد اور خوبصورت اسلوب سے اردو تنقید کو بہت کچھ دیا ہوتا -

امداد امام اثر کی تالیف کاشف الحقائق دو جلدوں میں طبع ہوئی تھی - اس میں اردو کی شعری اصناف کے ساتھ ساتھ شعراء پر بھی تنقید ملتی ہے - گو ان کی تنقید میں انگریزی اثرات نمایاں تو نہیں لیکن جہاں تک خود تنقید کا تعلق ہے تو وہ اسے انگریزی ہی کے حوالے سے پہچانتے ہیں - یہی نہیں بلکہ انہیں یہ

---

۱ - بحوالہ : اردو تنقید کا ارتقاء ص ۲۳۹ -

بھی احساس ہے کہ انگریزی انداز کی تنقید اردو اور فارسی میں عنقا ہے ۔ چنانچہ لکھتے ہیں :-

"وہ فن جسے انگریزی میں کری ٹی سزم کہتے ہیں فارسی اور اردو میں مروج نہیں ہے یہ وہ فن ہے جو سخن سنجوں کی کیفیت کلام سے بحث کرتا ہے ۔"[1]

اور اس معیار پر انھوں نے تذکروں کی تنقید کو پرکھتے ہوئے اس پر اعتراضات کیے ۔ یہ انداز نظر اس لحاظ سے اہم ہے کہ امداد امام اثر کی صورت میں غالباً پہلی مرتبہ انگریزی تنقید کو مدِنظر رکھتے ہوئے اردو تنقید کی کوتاہیوں کا احساس کرانے کی کوشش کی گئی تھی ۔ انھوں نے بعض مقامات پر انگریز شعراء کے ساتھ اردو شعرا کا تقابلی مطالعہ بھی کیا ہے مگر اس میں کچھ ایسی جدت یا دقت نظر نہیں ملتی ۔ امداد امام اثر اس بنا پر اہم ہیں کہ ان کی تحریروں میں انگریزی اثرات اردو تنقید میں جگہ بناتے نظر آتے ہیں ۔

☆ ☆ ☆

مجلس ترقی ادب

کی

تازہ ترین کتاب

کلیات میر

جلد دوم

مرتبہ

کلب علی خاں فائق

---

۱ ۔ امداد امام اثر ۔ کاشف الحقائق (جلد دوم) ص ۲۳۵ ، لاہور ، مکتبہ معین الادب ، ۱۹۵۶ع ۔

محمد عبد اللہ قریشی

حیات جاوداں

(۲)

اس مضمون کی پہلی قسط مارچ اپریل ۱۹۷۸ء کے ”صحیفہ“ میں شائع ہوئی تھی ، جس میں بعض افراد اور واقعات کا تعارف کراتے ہوئے میں نے وہ مادہ ہائے تاریخ پیش کیے تھے ، جو علامہ اقبال کے غور و فکر کا نتیجہ تھے اور جن کی بدولت متذکرہ اشخاص اور واقعات کو از سر نو حیات جاوداں نصیب ہوئی ، یہ اسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے -

(۱) نواب وقارالملک :

سر سید کے رفقائے خاص میں نواب وقار الملک اپنی ملی خصوصیات کے اعتبار سے تاریخ کی ایک عظیم شخصیت ہیں - وہ ۲۹ محرم ۱۲۵۷ھ (۲۰ مارچ ۱۸۴۱ء) کو موضع سراوہ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد منشی فضل حسین سنبھلی ملازم تھے - مشتاق حسین نام رکھا گیا - تاریخی نام ”چراغ احمد“ تھا - (۱۲۵۷ھ)

چھ سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کیا - کچھ عربی ، فارسی پڑھی - ۱۰ جون ۱۸۵۹ءکو دس روپے ماہانہ مشاہرے پر مدرس ہوئے - پھر انکم ٹیکس کی محرری کے بعد واصل باقی نویسی کی - بعد ازاں منصفی میں سر رشتہ دار ہوگئے - تحصیلداری کا امتحان بھی پاس کیا - لیکن ترقی کی رفتار تنخواہ اور مراتب دونوں میں سست رہی -

صغر سنی سے نماز کے پابند تھے - ایام ملازمت میں بھی جب نماز کا وقت آتا ، دفتر سے اٹھ کر چلے جاتے ، مسٹر کلون کلکٹر کو یہ طریق عمل ناگوار گزرا - انھوں نے ممانعت کی لیکن منشی مشتاق حسین نے اس حکم کی متابعت نہ کی اور ملازمت سے استعفی دے دیا -

سرکاری ملازمت کی ابتدا ہی میں سر سید احمد خاں سے متعارف ہو گئے تھے- مراد آباد کے قحط کے انسداد میں دونوں یکجا رہے - جب سر سید علی گڑھ

میں سب جج لگے تو یہ ان کے ناظر (ریڈر) مقرر ہوئے - یہاں سے قربت شروع ہوئی اور دوستی کی ایسی نیو پڑی کہ جب ملازمت سے مستعفی ہوئے تو سر سید کی سفارش سے حیدر آباد میں چار سو روپے ماہانہ پر لے لیے گئے - کچھ دنوں بعد وار نگل کے صوبہ دار ، پھر معتمد عالت اور کوتوال ہو گئے - سر آسمان جاہ کی جاگیر کا سارا کاروبار بھی انھیں سے متعلق تھا - عروج حیدر آباد کے زمانے میں شاہی اسپیشل ان کی نماز کے واسطے روکی گئی - انھوں نے صداقت ایمانی اپنے قلب میں جذب کر کے پابندی ارکان اسلام اپنے اوپر لازم قرار دے لی تھی -

۱۸۹۲ع میں پنشن لے کر وطن واپس آئے اور قوم کی تعلیمی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے - ان ہی کی کوشش سے مسلم لیگ کی بنیاد پڑی جس کا سب سے بڑا کارنامہ قیام پاکستان ہے -

نواب محسن الملک (مولوی مہدی علی مرحوم) کے انتقال پر علی گڑھ کالج کی سکریٹری شپ کے لیے کئی ٹرسٹیوں نے اپنے اپنے نام پیش کیے - ان میں ایک بزرگ ایسے بھی تھے جن کے خیالات قوم فروشی کے لیے مشہور تھے مگر قوم کی رائے نواب وقار الملک کی طرف مائل تھی - مولانا شبلی نے بے ساختہ فرمایا :[۱]

وقار الملک اگر ہوں جانشین مہدیٔ اعظم
تو اس تجویز کا منکر تو کوئی ہو نہیں سکتا
قیامت ہے کہ اک دجال بھی ہے اس کی کوشش میں
مگر ظاہر یہ ہے دجال مہدی ہو نہیں سکتا

آخر وقار الملک ہی سکریٹری منتخب ہوئے - ان ہی کے عہد نظامت میں مسلم یونیورسٹی کی تجویز بروئے کار آئی - کالج کا سکریٹری ہونا مسلمانان ہند کا سردار ہونا تھا - کراچی میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس نواب وقار الملک مرحوم کے اقبال کا اعلان تھا جب سارے ملک کے نمائندوں نے بالاتفاق ان کو اپنا رہنما یا سالار تسلیم کیا - اپنی مصروفیتوں سے وقت نکال کر ثوابین کی سرگذشت بھی لکھی اور تہذیب الاخلاق کی قلمی خدمت بھی کی - کالج ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا - لوگوں کا اعتماد کالج پر بڑھ گیا اور یہ حسن ظن پیدا ہو گیا کہ نواب صاحب کی توجہ سے طلبہ کی مذہبی اور اخلاقی حالت سدھر جائے گی - چنانچہ ایسا ہی ہوا - انھوں نے نماز کا خاص اہتمام کیا - مذہبی تعلیم و تربیت پر توجہ دی - لیکن طلبہ اس کڑی نگرانی سے خوش نہ ہوئے - طالب علمی اور آزادی کا زمانہ ، نو جوانی کی عمر اور شرارت اور کھیل کود کے

---

۱ - مخزن فروری ۱۹۱۳ع -

دن ، اس پر نواب صاحب کی یہ خواہش کہ طلبہ ہمیشہ مہذب ، متین اور ثقہ بنے رہیں مگر یہ کیسے ممکن تھا ۔ طرح طرح کے دلچسپ واقعات پیش آتے ۔ مولوی صاحب رات کو گشت کرتے ۔ اکثر ایسا ہوتا کہ برسات کی تیرہ و تار راتوں میں جب لڑکے ان کی آمد سے بے خوف ہوکر تاش کھیلنے یا کسی اور شرارت میں مصروف ہوتے ، نواب صاحب دفعتاً آ دھمکتے اور ان کی "السلام علیکم" کی آواز طلبہ کو وحشت زدہ کر دیتی ۔

سر سید کے ایک نواسے سید محمد نصیر بہت بے باک تھے ۔ ایک دفعہ پختہ بارک کی غرب رویہ لائن کے درمیانی کمرے میں ، جس کی درمیانی دیواروں میں دروازے لگے ہوئے تھے ، لڑکے تماشہ کر رہے تھے ۔ محمد نصیر راجہ اندر بنے بیٹھے تھے ۔ نواب صاحب کو خبر پہنچی ۔ فوراً آئے ۔ دروازہ کھٹکھٹایا ۔ سب لڑکے اندر ہی اندر اپنے کمروں میں بھاگ گئے ۔ صرف اس کمرے میں رہنے والا لڑکا اور نصیر رہ گئے ۔ دروازہ کھلا تو نواب صاحب اندر داخل ہوئے ۔ محمد نصیر کو دیکھا کہ وہ عمدہ لباس پہنے کرسی پر بیٹھے ہیں ، پوچھا ۔ کون ؟ محمد نصیر نے جواب دیا :

راجہ ہوں میں قوم کا اندر میرا نام[1]

نواب صاحب کی صحت کالج کی خدمت ہی کے زمانے میں جادۂ اعتدال سے ہٹ گئی تھی ۔ وہ ۱۹۱۲ء میں کالج کی معتمدی سے مستعفی ہو کر وطن آ گئے ۔ لیکن کبھی کبھی تبدیلی آب و ہوا اور بحالی صحت کے لیے منصوری اور ڈیرہ دون چلے جاتے تھے ۔ ۱۹۱٦ء میں فالج کا سخت حملہ منصوری میں ہوا ۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم اجمل خاں نے علاج کیا لیکن ایک سال کی پیہم علالت کے بعد ساعت موعود آ پہنچی ۔ ۲۴ ، ۲۵ جنوری ۱۹۱۷ کی درمیانی شب میں ایک بجے کے بعد قے ہوئی ، لرزہ آیا اور بخار ۱۰۴ درجے تک چلا گیا ۔ صاحبزادہ مشتاق احمد کو ڈیرہ دون میں تار دیا گیا ۔ وہ ۲٦ کو امروہہ پہنچ گئے ۔ جس وقت انھوں نے "ابا جان" کہہ کر پکارا تو آنکھیں کھول دیں اور محبت کے لہجے میں کہا ۔ "آ گئے" اس کے بعد ایسی غفلت طاری ہوئی ، کہ ۲۷ – ۲۸ کی درمیانی شب میں شمع حیات گل ہو گئی ۔ نواب سر مزمل اللہ خان فرماتے تھے کہ اخیر علالت میں مولوی (بعد میں سر) محمد یعقوب نے مزاج پوچھا تو جواب میں یہ شعر پڑھا :

نہ ڈول ہاتھ سے چھوٹا نہ مشک سینے سے
قسم ہے خواجہ کی باز آئے ایسے جینے سے[1]

---

۱ ۔ وقار حیات ۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے معارف میں "قافلہ کا آخری مسافر" کے زیر عنوان لکھا :

"علم والے علم کا دریا بہا کر چل دیے
واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیے

کچھ سخن ور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیے
کچھ مسیحا تھے کہ مردوں کو جلا کر چل دیے

نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبیر و سیاست کا ماتم کیا ۔ مولانا نذیر احمد کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا ۔ مولانا حالی کو رخصت کرتے ہوئے ہم نے سخنوری اور دقیقہ سنجی پر نالہ کیا ۔ لیکن نواب وقارالملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں اور اولوالعزمانہ اخلاق کی گمشدگی پر فریاد !"[1]

نواب وقارالملک کو خدا نے غیر معمولی صلاحیتیں عطا کی تھیں ۔ جتنی محنت زیادہ کرتے تھے ، اسی قدر دماغ جلا پاتا اور کام کرنے کی قابلیت بڑھتی تھی ، رائے قائم کرنے میں عجلت نہ کرتے تھے مگر ہر مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو جانچنے کے بعد جس نتیجے پر پہنچتے تھے ، اس پر جمے رہتے تھے ۔ ان کی زندگی کی کل جس طاقت کے بل پر چلتی تھی وہ مذہبی لگاؤ تھا ۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کا انجام بخیر ہوا ۔ علامہ اقبال نے تاریخ وفات کہی[2] :

نواب وقار الملک و ملت
افشاند سوئے جناں رقابش
بر لوحِ مزار او نوشتم
"انجام بخیر" ۔ با خطا بش
وقار الملک انجام بخیر
۱۳۳۵ھ

"انجام بخیر" کے عدد ۹۰۷ تھے ۔ ان میں "وقارالملک" کے ۴۲۸ عدد شامل کیے تو مطلوبہ تاریخ ۱۳۳۵ھ برآمد ہوئی اور اس کا واضح اشارہ "باخطابش" کے الفاظ میں موجود ہے ۔

---

۱ ۔ وقار حیات ص ۷۱ ۔
۲ ۔ علی گڑھ میگزین علی گڑھ نمبر ص ۱۳۳ ۔

(۲) اقبال کی بیگمات اور جاوید اقبال :

علامہ اقبال نے تین شادیاں کیں ۔ پہلی مرتبہ اس وقت زنجیر ازدواج میں جکڑے گئے جب ۱۸۹۳ء میں انھوں نے دسویں جماعت کا امتحان دیا تھا اور نتیجہ ابھی نہیں نکلا تھا ۔ یہ شادی گجرات کے ایک معزز کشمیری خاندان کے بزرگ خان بہادر ڈاکٹر عطا محمد خاں سول سرجن (متوفی ۱۹۲۴ء) کی بڑی صاحبزادی کریم بی بی سے ہوئی جو سرزمین حجاز میں پیدا ہوئی تھی اور دس سال تک اپنے والد کے ہمراہ کامران اور جدہ میں رہ کر دینی تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو چکی تھی ، خان بہادر صاحب ان دنوں فزیشن اور سرجن کی حیثیت سے وائس برٹش کونسل کے عہدے پر فائز تھے ۔ وہ دینوی لحاظ سے متمول ہونے کے باوجود قرآن مجید کے حافظ اور درویش منش انسان تھے ۔ یہی صفت ان میں اور علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد میں مشترک تھی ، جس کے باعث انھوں نے اپنی دختر ان کے فرزند کے حبالۂ نکاح میں دے دی ۔ اس بیوی کے بطن سے ایک بیٹی معراج بیگم اور ایک فرزند ڈاکٹر آفتاب اقبال پیدا ہوئے ۔ معراج بیگم تو ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو اٹھارہ برس کی عمر میں انتقال کر گئی مگر آفتاب اقبال بیرسٹر ایٹ لاء کراچی میں خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ۔

دو اولادیں ہونے کے باوجود پتہ نہیں کیا پیچ پڑا کہ اقبال کی اس بیوی سے ان بن ہو گئی اور اختلاف کی خلیج اتنی وسیع ہوئی کہ مصالحت کی کوئی کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی ۔ اسی زمانے کا ایک شعر ہے :

ہو گیا اقبال قیدی محمل گجرات کا
کام کرتے ہیں یہاں انسان بھی صیاد کا

یہ بیوی اقبال کی وفات کے بعد تک زندہ رہی ۔ ان کا انتقال ۱۹۴۶ء میں ہوا ۔ اقبال ان کو ہر ماہ باقاعدگی سے خرچ بھیج دیتے تھے ۔ مگر متاہل زندگی کی ناآسودگی کی وجہ سے اقبال کو دوسری شادی کی ضرورت لاحق ہوئی ۔ چنانچہ انگلستان سے پی۔ایچ۔ڈی اور بیرسٹری کی اسناد لے کر واپس آنے کے بعد موچی دروازہ لاہور کے ایک کشمیری خاندان کی لڑکی سردار بیگم سے ، جو اس وقت وکٹوریہ گرلز سکول میں پڑھتی تھی ۱۹۱۲ء میں نکاح ہو گیا مگر رخصتی ابھی عمل میں نہیں آئی تھی ، کہ بعض گمنام خطوط نے اقبال کو اس لڑکی سے بھی بدظن کر دیا اور رخصتی التوا میں پڑ گئی ۔

اسی دوران میں اقبال کے دوست سید بشیر حیدر صاحب لدھیانہ کے مشہور "نولکھا" خاندان کی لڑکی مختار بی بی کے رشتے کا پیغام لے آئے ، جو طے ہو گیا ۔

یہ لڑکی غلام محمد کی بہن اور ڈاکٹر سبحان علی کی سالی کی بیٹی تھی ، برات لدھیانے گئی اور نکاح ہو گیا ، جب یہ خاتون لاہور آئیں ، تو علامہ کی گجرات والی پہلی بیوی بھی یہاں پہنچ گئیں اور دونوں علامہ کے ساتھ انارکلی والے مکان میں رہنے لگیں ۔

اس طرح کچھ مدت گزرنے کے بعد موچی دروازہ والی لڑکی کے متعلق معلوم ہوا کہ گمنام خط لکھ کر اسے بدنام کرنے اور اقبال کو اس سے بدظن کرنے کا ذمہ دار نبی بخش وکیل تھا ، جو چاہتا تھا کہ یہ لڑکی اس کے بیرسٹر بیٹے سے بیاہی جائے ۔ دوسرے ذرائع سے بھی اس کی پاک دامنی ثابت ہو جانے کے علاوہ اس لڑکی نے خود علامہ کی خدمت میں خط لکھا کہ آپ نے ایک بہتان پر یقین کر لیا ۔ میں زندگی بھر آپ کے حق میں بیٹھی رہوں گی اور قیامت کے دن آپ کی دامن‌گیر ہوں گی ۔ آخر علامہ اس بیگم کو بھی لانے کے لیے تیار ہو گئے ۔ احتیاطاً نکاح دوبارہ پڑھا گیا اور اقبال اس کو لے کر سیالکوٹ چلے گئے ۔ یہ ۱۹۱۳ء کی بات ہے ۔ آٹھ دس روز کے بعد لاہور واپس آئے تو بہت خوش تھے ۔ اقبال کے دوست مرزا جلال‌الدین بیرسٹر کے استفسار پر فرمایا ۔

"اب میں بالکل مطمئن ہوں اور اپنے آپ کو جنت الفردوس میں خیال کرتا ہوں ۔"

جاوید ۱۹۲۴ء میں اور منیرہ ۱۹۳۰ء میں اسی بیگم کے بطن سے پیدا ہوئے۔ علامہ کے برادر زادے شیخ اعجاز احمد صاحب بیان کرتے ہیں :

"ہماری لاہور والی سردار چچی جان (والدۂ جاوید) اور لدھیانے والی مختار چچی جان قریباً دس گیارہ سال ایک ہی مکان میں چچا جان کے ساتھ رہیں ۔ ان کے درمیان سوکنوں والا تنازعہ کبھی میرے علم میں نہیں آیا ۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ چچا جان دونوں میں انتہائی عدل مدنظر رکھتے تھے اور ایک کو دوسری پر کسی قسم کی فوقیت نہ دیتے تھے۔ اس معاملے میں قدرت نے بھی ان کی مدد کی ، کیونکہ دس گیارہ سال تک دونوں میں سے کسی کے ہاں اولاد نہ ہوئی۔"[۱]

۱۹۲۳ء کی بات ہے کہ ایک روز شام کے وقت حضرت علامہ گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ لاہور والی بیگم طوطے کے بچے کو بڑی شفقت سے چوری کھلا رہی ہیں ۔ یہ کیفیت دیکھ کر ان کا دل بھر آیا اور ان کی زبان سے

۱ ۔ روزگار فقیر جلد دوم ص ۱۸۹ ۔

بے اختیار یہ الفاظ نکلے :

"الٰہی ! اس خاتون میں مادرانہ شفقت پیدا ہو چکی ہے ۔ اب اسے اولاد بھی عطا فرما۔"[1]

یہ دعاء قبول ہوئی اور نہ صرف وہ بلکہ لدھیانے والی بیگم بھی امید سے ہو گئیں وقت قریب آنے پر لاہور والی بیگم کو تو علامہ نے سیالکوٹ اپنی بھاوج کے پاس بھیج دیا اور لدھیانے والی بیگم اپنے میکے چلی گئیں ۔

۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو سیالکوٹ سے یہ دل خوش کن خبر ملی کہ لاہور والی بیگم کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے ۔ علامہ کے والد کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا ۔ اسی وقت دو نفل شکرانے کے ادا کیے ۔ پھر بچے کو گود میں لے کر پہلے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا پھر اس کے کان میں اذان کہی اور درازیٔ عمر کی دعا دی ۔ حضرت علامہ نے اپنے والد کو لکھا :

"میرے لیے یہ امر باعث مسرت ہے کہ میرے بیٹے نے اپنے آباؤ اجداد کے مسکن میں آنکھیں کھولیں اور وطن عزیز کی پاک فضاؤں میں پہلا سانس لیا۔"[2]

اسی خط میں آپ نے جاوید ، فاروق اور زبیر نام تجویز کیے ، جن میں سے جاوید سب کو پسند آیا ۔ حضرت علامہ نے تاریخی نام "ظفرالاسلام" (۱۳۴۳ھ) بھی نکالا[3] مگر اس نام کو جاوید کے مقابلے میں شہرت نصیب نہ ہو سکی ۔

لدھیانے سے بھی خیریت کے خط آ رہے تھے اور توقع تھی کہ اسی مہینے کے آخر میں وہاں سے بھی خوشی کی خبر آئے گی مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا ، شیخ اعجاز احمد کا بیان ہے :

"میں ایک کام کے سلسلے میں چچا جان کے پاس لاہور گیا ہوا تھا کہ لدھیانے سے چچی مختار کی تشویشناک علالت کی اطلاع آئی ۔ انھیں نمونیا ہو گیا تھا چچا جان بہت متفکر ہوئے اور مجھے ساتھ لے کر لدھیانے پہنچ گئے ۔ نمونیے نے چچی مختار کو بہت کمزور کر دیا تھا اور وہ وضع حمل کی زحمت برداشت کرنے کے قابل نہ رہی تھیں ۔ اس پر ستم یہ کہ درد زہ بند ہو گیا ، جو بڑی خراب علامت تھی ۔ آخر چچا نے ڈاکٹروں

---

۱ ۔ ذکر اقبال ص ۲۵۹ ۔
۲ ۔ اقبال اندرون خانہ ص ۳۶ ۔
۳ ۔ اقبال اندرون خانہ ص ۳۶ ۔

سے کہا کہ وہ جہاں تک ممکن ہو زچہ کی جان بچانے کی کوشش کریں اور بچے کا خیال نہ کریں ، لیکن ڈاکٹروں کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور اس نیک بی بی نے (۲۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو) جان دے دی ۔ وفات سے پندرہ منٹ پہلے چچا جان نے ان کو دیکھا اور حال پوچھا تو انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور کہا کہ "اچھی ہوں" حالانکہ اس وقت ان کا وقت بالکل قریب تھا اور یہ بات ان کو بھی معلوم تھی ۔ اس دردناک وفات نے چچا جان کے قلب پر بڑا اثر کیا ۔ ان کے کرب و بے چینی کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔"[۱]

علامہ اقبال چاہتے تھے کہ مرحومہ کی نماز جنازہ کوئی ایسا شخص پڑھائے جو قادری سلسلے سے تعلق رکھتا ہو مگر اس میں ناکامی ہوئی تو خود نماز جنازہ پڑھائی ۔ ۲۲ اکتوبر کو حضرت علامہ اقبال نے اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کو اس المناک واقعے کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا :

"کل آپ کی خدمت میں تار دے چکا ہوں ۔ تقدیر الٰہی کا مقابلہ تدبیر انسانی سے نہیں ہو سکتا ۔ مرحومہ کی موت کا منظر نہایت درد انگیز تھا ۔ خدا تعالیٰ اس کو اپنے جوار میں جگہ دے ۔ بہترین ڈاکٹروں کا علاج تھا ۔ مگر اللہ کے علم میں مرحومہ کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے ، درد کے عالم میں اس کی حالت اس قدر بے چارگی اور بے کسی کی تھی کہ میرے لیے اس کی طرف نگاہ کرنا بھی مشکل تھا اور میرا قلب سخت رقیق ہو گیا ۔"

مزید لکھا ،

"ایک معمولی انسان کو دنیا میں لانے کے لیے ، جو پچاس ساٹھ سال سے زیادہ اس دنیا میں نہیں ٹھہرتا ، نیچر اس قدر تکلیف ایک ضعیف عورت کو دیتی ہے۔"[۲]

اسی خط میں والدۂ جاوید کے نام بھی پیغام تھا کہ مرحومہ آخری وقت میں انھیں بہت یاد کرتی رہی ۔ انھیں مرحومہ کی خالہ زاد بہن کو ہمدردی کا خط لکھنا چاہیے کہ میں تاعمر تمھاری بہن ہوں اور ہمیشہ تمھیں ایسا ہی سمجھوں گی ۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا ۔

---

۱ ۔ روزگار فقیر جلد دوم ص ۱۹۰ ۔

۲ ۔ ایضاً ص ۱۹۱ ۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو لدھیانے ہی سے اقبال نے مولانا گرامی کو یہ رنج دہ خبر دیتے ہوئے لکھا :

''آپ کا والا نامہ لاہور سے ہوتا ہوا لدھیانے میں ملا - جو مصرع آپ نے تجویز فرمایا ہے ، اس کے متعلق پھر عرض کروں گا - فی الحال یہ رنج دہ خبر آپ کو دینا ہے کہ میری لدھیانے والی بیوی ۲۱ اکتوبر کو یہاں لدھیانے میں انتقال کر گئی ہے - ان کو نمونیا ہو گیا تھا اور انسانی علم طب کی کوئی تدبیر ان کی زندگی نہ بچا سکی - اناللہ و انا الیہ راجعون - مرحومہ دس بارہ سال میری شریک حیات رہیں اور اس مدت میں انہوں نے جو میری خدمت گذاری کی ، کم کسی بیوی نے اپنے شوہر کی کی ہو گی - خدا تعالیٰ ان کو اس کا اجر جزیل عطا فرمائے - میں ۱۹ اکتوبر سے لدھیانے میں ہوں - آج شام لاہور واپس جاؤں گا - آپ سے التماس ہے کہ کوئی عمدہ مادۂ تاریخ نکالیے ، جس کو ان کے مزار پر کندہ کرایا جائے - میں خود بھی فکر کروں گا - چونکہ آپ بزرگ ہیں ، اس واسطے تبرکاً آپ سے مادۂ تاریخ وفات کی درخواست کرتا ہوں - ۱۳۴۳ ہجری ہے - امید ہے مزاج بخیر ہوگا -''[1]

رسم قل ادا ہو جانے کے بعد اقبال لاہور آ گئے - ان کی طبیعت کئی دن تک نہایت افسردہ اور پریشان رہی - یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ حضرت علامہ نے مولانا گرامی سے مادۂ تاریخ کی جو فرمائش کی تھی ، وہ انہوں نے پوری کی یا نہیں ، البتہ اقبال نے مرحومہ کی جو لوح مزار تیار کر کے لاہور سے لدھیانے بھجوائی ، اس پر ان کا اپنا حسب ذیل قطعہ تاریخ کندہ تھا :

وا دریغا ز مرگِ ہم سفرے
دلِ من در فراق او ہمہ درد

ہاتف از غیب داد تسکینم
سخن پاک مصطفیٰ آورد

بہر سالِ رحیل او فرمود
بشہادت رسید و منزل کرد

من مات بطوناً شہید[1]
۱۳۴۳ھ

---

۱ - مکاتیب اقبال بنام گرامی ص ۲۳۸ -

مرحومہ کا انتقال زچگی کی حالت میں ہوا تھا ، اس لیے حضرت علامہ نے دوسرے شعر کے مصرعِ ثانی اور مادۂ تاریخ میں اس مشہور حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے :

"المبطون شہید"

"مبطون" سے مراد عارضۂ اسہال سے فوت ہونا ہے لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ مطلق پیٹ کی بیماری سے مرنے والے کو بھی درجۂ شہادت نصیب ہوتا ہے۔"[1]

والدۂ جاوید سالہا سال سے مریض چلی آتی تھیں ۔ ان کو جگر اور اسہال کی شکایت تھی ، علامہ نے ان کے علاج معالجہ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا ۔ سید نذیر نیازی کے نام حضرت علامہ کے مکتوبات سے اس کی کیفیت معلوم ہو سکتی ہے ۔ لیکن اپریل ۱۹۳۵ء میں ان کو میعادی بخار ہوا ، جس سے حالت تشویشناک ہو گئی۔ آخر ۲۳ مئی کی شام کو ساڑھے پانچ بجے وہ اس جہان سے رخصت ہو گئیں ۔ اقبال نے کہا :

"ان کے آلام و مصائب کا اور میرے اطمینان قلب کا خاتمہ ہوا ۔ اللہ فضل کرے ۔ ہر چہ از دوست می رسد نیکوست" ۔

والدۂ جاوید کا سانحۂ ارتحال اس لحاظ سے اور بھی افسوس ناک تھا کہ میو روڈ (جسے اقبال روڈ کہتے ہیں) والی نئی کوٹھی "جاوید منزل" میں منتقل ہوئے ابھی چند ہی دن ہوئے تھے ۔ انھیں بیبیاں پاک دامناں کے قبرستان میں ایک اونچے ٹیلے پر دفن کیا گیا ۔

انتقال سے کچھ روز بعد حفیظ ہوشیار پوری مرحوم اپنے استاد صوفی غلام مصطفیٰ تبسم مرحوم کے ہمراہ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ اس وقت علامہ فکر تاریخ میں محو تھے ، صوفی صاحب سے کہنے لگے ۔ "سرمۂ مازاغ" (۱۳۵۴ھ) کے متعلق کیا خیال ہے؟ صوفی صاحب مادۂ تاریخ کی معنویت پر غور کرنے لگے ۔ اقبال پُر دل ہوئے ۔ انھوں نے گفتگو کا رخ ہی بدل دیا ۔ حفیظ ہوشیار پوری مرحوم لکھتے ہیں :

"مجھے معلوم نہیں والدۂ جاوید کی وفات کا مادۂ تاریخ آخر کیا طے پایا ۔ مرحومہ کے مزار پر غالباً قطعۂ تاریخ درج ہے ۔ مجھے افسوس ہے کہ تلاش کے باوجود مجھے اس کا سراغ نہ مل سکا ۔ اس سلسلے میں ایک بات بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ "سرمۂ مازاغ" کا مادۂ تاریخ علامہ اقبال

---

۱ ۔ صحیح بخاری ، کتاب الاذان ، باب فضل التہجیر الی الظہر ، روایت ابوہریرہ، ص ۹۰ ، مطبوعہ اصح المطابع کتب خانہ رشیدیہ دہلی ۔

کے غور و فکر کا نتیجہ نہ تھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ گوئی پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ اُن میں ہم عدد الفاظ کی فہرست میں الھیں یہ مادہ بھی نظر آیا ۔ چنانچہ گلبن تاریخ مصنفہ میر مہدی حسین الم کے صفحہ ۵۵۸ پر اورآئینۂ تواریخ مصنفہ حکیم حافظ الٰہی بخش شائق کے صفحہ ۳۷۰ پر ''سرمۂ مازاغ'' ۱۳۵۶ھ کے تحت میں درج ہے ۔''[1]

یہی مادۂ تاریخ ایک اور کتاب ام التواریخ مولفہٗ حسین علی فرحت مطبوعہ میرٹھ کے صفحہ ۳۲۲ پر بھی موجود ہے مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ ہجوم مصائب کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں اقبال ان کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہے ہوں گے قطعاً خلاف واقعہ ہے ۔ کیا ان کی نظر قرآن مجید کی اس آیت پر نہیں جا سکتی تھی؟ ''مازاغ البصر وما طغٰی''۔ دراصل یہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے انھوں نے یہ مادۂ تاریخ اخذ کیا ۔ اگر اس سے پہلے یہ کسی اور کو سوجھ بھی چکا تھا ؛ تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ وہ اقبال کے علم میں بھی تھا؟

میں نے بیبیاں پاک دامناں ایمپرس روڈ کے قبرستان میں والدۂ جاوید کی قبر دیکھی ہے ۔ یہ ایک بلند ٹیلے پر واقع ہے اور اتنی اونچی بنائی گئی ہے کہ چبوترے پر چڑھے بغیر تعویز نہیں نظر آتا ۔ سنگ مزار حاجی دین محمد کاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ۔ وہ لاہور کے ایک باکمال خوش نویس تھے اور علامہ کے قدیم تربن اور مخلص دوستوں میں شمار ہوتے تھے ۔ قطعہ اس طرح کندہ ہے :

باحی یا قیوم

راہی سوئے فردوس ہوئی مادر جاوید
لالے کا خیاباں ہے مرا سینہٗ پر داغ

ہے موت سے مومن کی نگہ روشن و بیدار
اقبال نے تاریخ کہی ۔ '' سرمۂ مازاغ ''

۱۳۵۴ھ

مادۂ تاریخ وہی ہے ، جس کا ذکر حفیظ ہوشیار پوری مرحوم نے اپنے مضمون میں کیا تھا مگر اشعار سے اس کی معنوی حیثیت بھی نمایاں ہو جاتی ہے اور ان تاثرات کا بھی پتہ چلتا ہے ، جو رفیقۂ حیات کی جدائی کے غم سے حضرت علامہ کے قلب و دماغ میں اس وقت موجزن تھے ۔

---

۱ ۔ حفیظ ہوشیار پوری ، مضمون تاریخ گو اقبال (۱۳۷۱ھ) مطبوعہ روزنامہ آفاق لاہور بابت ۲۱ اپریل ۱۹۵۲ء ص ۳ ۔

غزل

روح آباد ہوئی ، دل کے اجڑ جانے سے
چشمۂ نور ابلتا ہے سیہ خانے سے

میرے چہرے پہ نہ جا ، جھانک تو سینے میں مرے
درد مٹتا ہے کوئی زخم کے بھر جانے سے

روشنی کے لیے ترسیں گی نگاہیں کیا کیا
ظلمتیں محو ہوئیں جب مرے کاشانے سے

شعلہ خوئی نے تری ، تجھ کو سجھایا نہ کبھی
لوگ قربان ہوئے جاتے ہیں پروانے سے

اپنے ہی سانس کی آواز سے ڈر جاتا ہوں
گھر کا یہ حال ہوا ایک ترے جانے سے

کوئی دن گریہ و ماتم سے نہیں ہے خالی
روز اٹھتے ہیں نشاں دل کے عزا خانے سے

موت ہی ایک حقیقت ہے اسی کو چاہوں
جی کو بہلائیے کب تک کسی افسانے سے

منزل دل میں وہ رونق ، وہ سکوں پایا ہے
لوٹ کر آیا ہوں جیسے کسی ویرانے سے

دل کجا ، صبر کجا —— دھوپ کجا ، ہرک کجا
ہوش کی بات کیا کرتے ہیں دیوانے سے

تیرے صدقے مرے لاہور! یہ کیا بات ہوئی
تیرے کوچے بھی تو اب لگتے ہیں ویرانے سے

میر کے شعر پڑھو ، دل کو سنبھالو شہرت
خواریاں اور چمک جاتی ہیں پچھتانے سے

★

غزل

یہ سوچ کر کہ تیری جبیں پر نہ بل پڑے
بس دور ہی سے دیکھ لیا اور چل پڑے

دل میں پھر اک کسک سی اٹھی مدتوں کے بعد
اک عمر کے رکے ہوئے آنسو نکل پڑے

سینے میں بے قرار ہیں مردہ محبتیں
ممکن ہے یہ چراغ کبھی خود ہی جل پڑے

اے دل تجھے بدلتی ہوئی رت سے کیا ملا
پودوں میں پھول اور درختوں میں پھل پڑے

اب کس کے انتظار میں جاگیں تمام شب
وہ ساتھ ہو تو نیند میں کیسے خلل پڑے

سورج سی اس کی طبع ہے ، شعلہ سا اس کا رنگ
چھو جائے اس بدن کو تو پانی ابل پڑے

شہزاد دل کو ضبط کا یارا نہیں رہا
نکلا جو ماہتاب ، سمندر اچھل پڑے

★

غزل

قابو میں چاند ہی نہیں ، سورج بھی بس میں ہے
انساں ہوں ، کائنات مری دسترس میں ہے

پھرتا ہوں زندگی کے تعاقب میں روز و شب
ہر مرحلہ مری نگہ دور رس میں ہے

شبہائے برق بار سے خائف نہیں ہوں میں
آنکھوں میں روشنی ہے ، حرارت نفس میں ہے

پتھر کو روپ بخش کہ آئینے کو جلا
فن کار ! تیرا حسنِ ہنر تیرے بس میں ہے

یارو ! چراغِ لالہ و گل بجھ گئے تو کیا
پوشیدہ ایک شعلہ ابھی خار و خس میں ہے

پابند رنگ کی ہے سر آسماں اڑان
تصویر کیا ہے ؟ گویا پرندہ قفس میں ہے

سوچو تو قافلہ بھی نظر آئے گردِ رہ
سمجھو تو اک سکوت صدائے جرس میں ہے

آزادیٔ خلوص و محبت کسے نصیب
اے رشک ہر بشر ابھی دامِ ہوس میں ہے

★

غزل

نکلے ساگر سے تو لوٹتے ہوئے ساحل کیا تھے
کیا کہیں اس سے ، جدائی کے مراحل کیا تھے

آئینے ہجر کے ٹوٹے تو ہوا پھر احساس
درد کے عکس میسر تجھے اے دل! کیا تھے

تو چناروں سے جو ابھری تو لگا یوں ، جیسے
آتشِ ہجر سے اشجار بھی گھائل کیا تھے

تونے اک طرفہ عنایت سے نوازا ، ورنہ
تجھ سے ملنے کو مرے پاس وسائل کیا تھے

خوں کی حدّت سے بھی جو حل نہ ہوئے تھے قدرت
سوچتا ہوں کہ وہ دراصل مسائل کیا تھے

★

شہرِ خیال

۱- شہرِ خیال اک جنت ہوگی
جس میں ہر اک نعمت ہوگی
پاکیزہ تنہائی ہوگی
ہجر سے خالی فرصت ہوگی
میٹھی یادیں ، میٹھا برہا
درد میں شہد کی لذت ہوگی
جب بھی میں لکھنے بیٹھوں گا
تیرے وصل کی ساعت ہوگی
جب بھی میں آئینہ دیکھوں
آنکھ کو تری زیارت ہوگی
تیرا اسم زباں پر ہوگا
اور دن رات تلاوت ہوگی
شہر صحیفوں جیسا ہوگا
ہر صورت اک آیت ہوگی

۲- سچ کہنے کی جرأت ہوگی
چپ رہنا اک غیبت ہوگی
ہر اک ہاتھ گواہی دے گا
ہر اک آنکھ عدالت ہوگی
چہروں پر اخبار چھپیں گے
ہر اک سرخی خوش خط ہوگی

ویسا ہی وہ پھل پاوے گا
جیسی جس کی نیت ہوگی
پھولوں جیسے فنکاروں کی
خوشبو جیسی شہرت ہوگی
آنکھ میں لفظ خزانہ ہوں گے
دل میں علم کی دولت ہوگی
اک تسبیح کے دانوں جیسی
سارے شہر میں نسبت ہوگی

۳۔ صبح اک صبح ضیافت ہوگی
شام ، اک جشن کی صورت ہوگی
تختۂ گل اک مسجد ہوگا
سیر چمن عبادت ہوگی
میٹھے پھل اور گہرے سائے
ہر اک پیڑ کی خصلت ہوگی
اجلے بستر کی گودی میں
ماؤں جیسی شفقت ہوگی
صبح بہاراں ، صبح ازل ، اور
پت جھڑ شام قیامت ہوگی
ابر کی چادر تن جائے گی
جب بھی دھوپ میں شدت ہوگی
مہکا مہکا طرز تکلم
سب بچوں کی عادت ہوگی

۴۔ سبزہ ایک عمارت ہوگی
جس پر بادل کی چھت ہوگی
دن کی دھوپ کی دیواروں میں
شام اک در کی صورت ہوگی

طاق میں سورج جلتا ہوگا
میز پہ چاند کی صورت ہوگی

تیری یاد بھری خاموشی
میرے گھر کی زینت ہوگی

تیری آہٹ تیری دستک
میرے صبر کی قیمت ہوگی

موسم تیرا پرتو ہوگا
خوشبو تری صباحت ہوگی

صبح و شام کے نظاروں میں
تیرے حسن کی رنگت ہوگی

۵۔ صبح ازل اک حیرت ہوگی
جس سے خلق عبارت ہوگی

جب تونے آنکھیں سوچی تھیں
جانے وہ کیا ساعت ہوگی

جب تونے لب لکھے ہوں گے
اس پل پیاس کی شدت ہوگی

تیرے سحر بیان سخنوں میں
زلف بھی ایک حکایت ہوگی

تیرے فنِ نقاشی کی
عارض بھی اک صورت ہوگی

تیرے ہنرِ دست گری کی
شاخوں شاخوں شہرت ہوگی

تیرے خوش الحان سروں میں
گوشِ سماع اک قرأت ہوگی

آزرِ کل پہ جسمِ مکمل
تیرے فن کی قدرت ہوگی

★

چھ رنگیں دروازے

چھ رنگوں کے پھول کھلے ہیں
میرے گھر کے آگے
کسی نئے سکھ کے دروازے
خواب سے جیسے جاگے

ان کے پیچھے رنگ بہت ہیں
اور بہت اندازے
ان کے پیچھے شہر بہت ہیں
اور بہت دروازے

★

کیتھارسس

دوست تھی میں تیرے خوابوں کی
یاد ہے تو نے مری بانہوں میں
بالوں کے گجرے پہنائے تھے
تو نے میرا جھوٹا پانی
پی کے میرے ہونٹ سنہرے
چمکائے تھے
تیرے گھر میں میں آئی تھی
حرف ہوس وصل کے ہرائے تھے

کچے پیالے پر منہ رکھ کے
میں نے پیاس کی خوشبو سونگھی
اوس نے دبد سے رشتہ باندھا
اس نے رنگ کی چولی پہنی

گھر میں خواب کی شاخ لگا کے
سوچا تھا دیوار ڈھکے گی
بیل عمریا چڑھ جائے گی
کتنے میٹھے خواب تھے جن کا

ذکر کرو تو ہونٹ کسیلے
کتنے انوکھے رشتے تھے وہ
خواب سے سچے ، خواب سے جھوٹے

جینا مرنا ، ڈھولک پرانا
بچھڑ کے تجھ سے وہ بھی جئے گا
تو بھی ہنسے گی زندہ رہے گی
اس کے گھر میں سبھا سجے گی

★

کافی

تیرا سپنا امر سمے تک
اپنی نیند ادھوری
اپنی نیند ادھوری

کالے پنکھ کھلے کوئل کے
کوک کی بن میں دوری
اپنی نیند ادھوری

تیرے تن کا کیسر مہکے
خوش بو اڑے سندھوری
اپنی نیند ادھوری

سزا جزا مالک کا حصہ
بندے کی مزدوری
اپنی نیند ادھوری

میرا عشق زمین کی مٹی
نال نال نال نوری
اپنی نیند ادھوری

تیرا کبر تری یکتائی
اپنا من منصوری
اپنی نیند ادھوری

دن بھر راکھ اڑی سانسوں کی
جیون رات لندوری
اپنی لیند ادھوری

تیرا ہجر رتوں کی ہجرت
تیرا وصل حضوری
اپنی لیند ادھوری

تن کو توڑ کے پھوٹی خواہش
ظاہر کیا مستوری
اپنی لیند ادھوری

*

خیال رکھنا

میں جا چکوں تو خیال رکھنا
رفیق میرے زمین کی ان دراز پلکوں سے اشک بن کر جڑے ہوئے ہیں
خیال رکھنا کہ سارے موسم بس ایک دکھ کے پیامبر ہیں
جو میرا دکھ ہے

یہ میرا دکھ ہے
کہ میں نے اس دکھ کی پرورش میں
لہو کا لقمہ ، بدن کا ایندھن کیا فراہم
یہ دکھ مرا ہے مرا رہے گا
کہ آسمانوں کی سمت میرے سوا کوئی صبح کا ستارا رواں نہیں ہے

★

حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی

بچپن میں دیکھے ہوئے بعض چہرے ، بعض مناظر دل و دماغ پر کچھ اس طرح نقش ہو جاتے ہیں کہ عمر بھر محو نہیں ہوتے۔ حضرت آغا شاعر قزلباش کو جب میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تو ہرچند اس وقت میری عمر چھ سال سے زیادہ کی نہ ہوگی مگر ان کے چہرے کے خال و خط میں عمر بھر نہیں بھلا سکا۔

ان دنوں ہم اندرون موچی دروازہ لال کنویں کے قریب ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ اور وہیں ایک گلی میں وہ مدرسہ تھا جہاں میں ہر روز صبح سویرے پڑھنے جایا کرتا تھا۔ یہ پہلی جنگ عظیم کے لگ بھگ کا زمانہ تھا۔

موچی دروازے کا یہ علاقہ یوں بھی بڑا بارونق اور گنجان آباد تھا۔ مگر عشرۂ محرم میں تو خاص طور پر یہاں کے کوچہ و بازار کی چہل پہل دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ہر گلی میں کئی کئی امام باڑے تھے جنہیں مجالس عزا کے لیے بڑے اہتمام سے سجایا جاتا تھا اور بازاروں میں قدم قدم پر شہدائے کربلا کی یاد میں دودھ ، شربت یا ٹھنڈے پانی کی سبیلیں لگائی جاتی تھیں۔

لاہور میں نواب فتح علی خاں قزلباش اس زمانے کی ایک بڑی مقتدر و معروف ہستی تھے ان کی حویلی جو "مبارک حویلی" کہلاتی تھی اور اپنی مجالس عزا کے لیے شہر بھر میں منفرد تھی ، اسی علاقے میں تھی۔ نواب صاحب اپنی ان مجالس کے لیے لکھنؤ ، رام پور بلکہ ایران تک سے مشہور و معروف ذاکروں اور مرثیہ خوانوں کو بلواتے اور ان کی بڑی تکریم کرتے تھے۔

میرے والد مرحوم جناب عبدالعزیز ان مجالس میں اکثر حاضری دیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جایا کرتے یا یوں کہنا چاہیے کہ میں بھی ان کے ساتھ ہو لیتا۔ ہرچند میں اپنی کم سنی کی وجہ سے نہ تو واقعات کربلا کو سمجھ سکتا تھا اور نہ مراثی یا شعر و شاعری سے لطف اندوز ہونے ہی کا مجھ میں شعور تھا۔ تاہم ان مجالس کی کہا گہمی اور گرما گرمی میرے لیے خاصی پرکشش تھی۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں والد کے ساتھ اسی قسم کی ایک مجلس میں شریک تھا تو ایک غلغلہ سا ہوا اور ایک بڑے رعب داب والے شخص مرثیہ پڑھنے کے لیے اٹھے اور منبر پر آکر کرسی پر بیٹھ گئے ۔ ان کا چہرہ خوب سرخ و سفید تھا ۔ آنکھیں بڑی بڑی ، سر پر پگڑی (مندیل) مونچھوں کو بل دیا ہوا ۔ ان کے بیٹھتے ہی حاضرین مجلس بلند آواز میں صلوات پڑھنے لگے ۔ جب خاموشی ہوئی تو انھوں نے بستے سے ایک کاپی نکالی اور بڑی گرجدار آواز میں پڑھنا شروع کیا ۔ ان کے پڑھنے کا انداز اور مرثیہ خوانوں سے بڑا مختلف تھا ۔ وہ آواز کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کے اشاروں اور چشم و ابرو کی جنبشوں سے بھی بڑا کام لیتے تھے ۔ جس سے ایک سماں بندھ جاتا تھا ۔ ان کی آواز کی کڑک اور ان کی حرکات و سکنات نے میرے دل پر کچھ ایسا اثر کیا کہ میں دیر تک ایک محویت کے عالم میں انھیں دیکھتا کیا ۔ حالانکہ ان کی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ۔ ادھر اہل مجلس تھے کہ برابر واہ واہ سبحان اللہ کہتے اور زور زور سے صلوات پڑھتے جاتے تھے ۔

ان کی شکل و شباہت اور ان کی مرثیہ خوانی کا انداز میرے دل پر کچھ ایسا نقش ہوا کہ واقعہ کے دس بارہ برس بعد جب میں نے کربلا گامے شاہ میں انھیں دوبارہ مرثیہ پڑھتے دیکھا تو بچپن کی وہ یاد اچانک تازہ ہو گئی اور مجھے انھیں پہچاننے میں کچھ دقت نہ ہوئی ۔

میں اب بلوغت کو پہنچ چکا تھا اور خود کو شعر و ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم سمجھنے میں فخر محسوس کرتا تھا ۔ اس دس بارہ سال کے عرصے میں ، میں نے اردو نظم و نثر کا خاصا گہرا مطالعہ کر لیا تھا ۔ اور میں افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش کے مرتبہ شاعری اور نثرنگاری سے بھی بخوبی واقف ہو چکا تھا۔

آغا صاحب اس دس بارہ سال کے عرصے میں خاصے بدل چکے تھے ۔ اور کھولت کے آثار نمایاں تھے ۔ مگر ان کی آواز کی گھن گرج ابھی تک باقی تھی ۔ جس کا مشاہدہ میں نے بچپن میں کیا تھا ۔ مرثیہ خوانی کا انداز بھی قریب قریب ویسا ہی تھا ۔ یعنی آواز کے زیرو بم سے ، ہاتھوں کے اشاروں اور چشم و ابرو کی جنبشوں سے ڈرامائی کیفیت پیدا کرنا اور خود شعر کی تصویر بن جانا ۔

اس کے بعد میں نے آغا صاحب کا کلام کئی نجی محفلوں میں سنا ۔ جن میں سید احمد شاہ بخاری (پطرس) ، سید امتیاز علی تاج ، سید عابد علی عابد ، ڈاکٹر تاثیر ، مولانا سالک ، شیخ عبداللطیف تپش ، دیوان آنجہانی شرر جو ان کے شاگرد

رشید تھے اور کئی اور اہلِ ذوق حضرات شریک ہوا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آغا صاحب لاہور کے انارکلی بازار میں رہا کرتے تھے ان کے مداحین اور احباب کا حلقہ بھی بڑا وسیع تھا۔ جن میں سرفہرست حضرت علامہ اقبال کا نام آتا ہے جو ان کے استاد بھائی تھے۔ علاوہ ازیں شیخ عبدالقادر، نواب فتح علی خاں، مولانا حالی اور متعدد اور اکابر ان کے کمالِ فن کے معترف اور قدر داں تھے۔

آغا صاحب کا شعر خوانی کا طریقہ بھی ان کی مرثیہ خوانی کی طرح بڑا منفرد اور پر تاثیر تھا۔ وہ بڑے جذبے کے ساتھ اپنی بلند اور گرجدار آواز میں تحت اللفظ پڑھا کرتے تھے اس انداز سے کہ خود شعر کی تفسیر بن جاتے تھے۔ مشاعرے میں ان کے بعد کسی اور شاعر کا رنگ مشکل ہی سے جمتا تھا۔

آغا صاحب کی شخصیت بڑی جامع کمالات تھی۔ وہ بڑے نغز گو شاعر تھے۔ داغ کے شاگرد تھے۔ اور شاگرد بھی ایسے کہ استاد کی وفات کے بعد ان کی جانشینی کے سچے دعوے دار تصور کیے جاتے تھے۔ وہ ہر صنفِ سخن پر قادر تھے۔ اور مرثیہ نگاری میں بھی بہت اونچا مقام رکھتے تھے مگر بدقسمتی سے یہ صنف ان کے دیگر کمالاتِ شعر و ادب میں کچھ دب کر سی رہ گئی تھی۔ درحقیقت ان کی طبیعت کا اصلی جوہر غزل ہی میں کھلتا ہے۔ اس صنف میں انھوں نے استاد کی پوری تقلید کی۔ اور ان کے رنگ کو کامیابی کے ساتھ نبھایا۔ چنانچہ یہ کہنا بےجا نہ ہوگا کہ داغ کا اندازِ سخن، زبان کے تیور، شوخی اور چلبلا پن، زبان کی حلاوت اور سلاست و صفائی جس قدر آغا صاحب کے کلام میں نمایاں ہے اتنی کسی اور شاگرد داغ میں نہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار سے آپ خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں:

اُف اُف وہ اچٹتی سی نگاہِ غلط انداز
اس طرح سے دیکھا ہے کہ گویا نہیں دیکھا

لو ہم بتائیں غنچہ و گل میں ہے فرق کیا
اک بات ہے کہی ہوئی اک بے کہی ہوئی

ماشا اللہ رقیبوں کا یہ جھرمٹ آہا
آج تو شمع بنے بیٹھے ہو پروانوں میں

حشر میں انصاف ہوگا بس یہی سنتے رہو
کچھ یہاں ہوتا رہا ہے کچھ وہاں ہو جائے گا

یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

غزل کے علاوہ نظم نگاری میں بھی آغا صاحب نے اپنی جدت طبع کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں ۔ ان کی ایک نظم "ڈیلیا" کے پھول کے بارے میں ہے ۔ اور نیچرل شاعری کا بہت کامیاب نمونہ ہے ۔ یہ شیخ عبد القادر کے رسالہ مخزن میں شائع ہو کر بے حد مقبول ہوئی تھی ۔ بعد میں اسے حضرت ریاض خیر آبادی نے اپنے گلدستہ "فتنہ" میں بڑی تعریف کے ساتھ نقل کیا تھا ۔ علاوہ ازیں انہوں نے قومی نظمیں بھی لکھیں ۔ جن میں انہوں نے ہند و مسلم اتحاد اور آزادی وطن کے نغمے گائے تھے ۔

نظم کے ساتھ ساتھ آغا صاحب نے نثر میں بھی اپنے ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں ۔ انہوں نے متعدد ناول لکھے جن میں "ہیرے کی کنی" نے سب سے زیادہ شہرت پائی ۔ یہ طبقہ امراء کی حسن پرستی اور عشق بازی کا ایک دلچسپ مرقع ہے ۔ اسی طرح انہوں نے کئی ناٹک بھی لکھے جن میں "قتل نظیر" اور "حور جنت" مدتوں اسٹیج پر دکھائے جاتے رہے ۔ اور بے حد مقبول ہوئے ۔

آغا صاحب دوسری زبانوں سے ترجمہ کرنے کی بھی حیرت انگیز مہارت رکھتے تھے ۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ منظوم ترجمہ قرآن ہے جو ایک اعجاز کی سی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں قافیہ و ردیف کی قید کے ساتھ مطالب قرآن کو ایسی سلیس زبان اور ایسے سلجھے ہوئے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے ۔ کہ نثر میں بھی اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا ۔ چنانچہ ملک بھر کے علمائے دین نے اسے پسندیدگی کی سند عطا کی تھی ۔

نمونے کے طور پر سورۃ فاتحہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو :

سورۃ الفاتحہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے ۔

ہے نام سے خدا کے آغاز کا (اجالا)
جو مہربان بڑا ہے ، بے حد جو رحم والا

الحمد للہ رب العالمین الرحمٰن الرحیم

سب تعریف اللہ کو ہے ، جو صاحب سارے جہان کا ، بہت مہربان نہایت رحم والا ۔

تعریف سب خدا کو جو رب ہے عالموں کا
جو مہربان بڑا ہے ، بے حد جو رحم والا

مالک یوم‌الدین ایاک نعبد و ایاک نستعین

مالک انصاف کے دن کا ، تجھ ہی کو ہم بندگی کریں اور تجھ ہی سے مدد چاہیں ۔

محشر کے دن کا مالک (روز جزا کا والی)
تجھ کو ہی پوجتے ہیں ، ہم تیرے ہی سوالی

اهد ناالصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم

چلا ہم کو راہ سیدھی ، راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل کیا ۔

سیدھی ڈگر پہ لے چل (ثابت قدم بنا دے)
نعمت جنھیں عطا کی ان کی روش سجھا دے

غیر المغضوب علیهم ولاالضالین

نہ وہ جن پر غصہ ہوا اور نہ بھکنے والے

نے ان کی راہ جن پر قہر و غضب ہوئے ہیں
نے ان کو جو بھک کر گم راہ ہو گئے ہیں

ان کے فارسی شاعری کے منظوم ترجمے بھی ملک میں کچھ کم ،قبول نہیں ہوئے اور رباعیات عمر خیام کا ترجمہ تو ایسا لاجواب کیا کہ نصف صدی کا زمانہ گزر جانے پر بھی اس کی آب و تاب میں فرق نہیں آیا رباعیات خیام کے اور لوگوں نے بھی ترجمے کیے ہیں ۔ مگر دلی کی ٹکسالی زبان اور بولی ٹھولی کا جو مزہ اس میں ملتا ہے اور کسی ترجمے میں نہیں ملتا ۔ مثال کے طور پر ذرا اس پہلی رباعی کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے :

در کھول کوئی ! کھولنے والا ہے تو
رستہ کوئی دے ! جگت اجالا ہے تو
میں ہاتھ کسی ہاتھ میں کب دیتا ہوں
سب خاک ہیں ایک رہنے والا ہے تو

ترجمے کی خوبی برجستگی دیکھنے کے لیے ذرا اصل سے اس کا مقابلہ کیجیے :

بکشانے درے کہ در کشایندہ توئی
بنمانے رہے کہ رہ نمایندہ توئی

من دست ہیچ دست گیرے ندیم
کایشان ہمہ فانی اند و پائندہ توئی

خیام کے علاوہ آغا صاحب نے فردوسی ، حافظ ، سعدی ، جامی ، صائب وغیرہ متأثیں شعرائے فارس کی منظومات کے نظم میں ترجمے کیے ہیں ، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ آغا صاحب کو زبان پر کس درجہ قدرت حاصل تھی ۔

آغا صاحب نے ایک صحافی کی حیثیت سے بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں ۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز صحافت ہی سے کیا تھا ۔ وہ مدتوں امرتسر کے مشہور اخبار "وکیل" اور لاہور کے "وطن" میں ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے ۔ اس کے بعد انھوں نے خود اپنا ماہنامہ "آفتاب" جھالرا پاٹن (راجپوتانہ) سے نکالا ۔ اس رسالے میں بھی "مخزن" کی طرح علمی و ادبی مضامین شائع ہوا کرتے تھے ۔ یہ رسالہ کچھ عرصہ بند رہنے کے بعد دوبارہ لاہور سے جاری کیا گیا تھا ۔

میں نے آغا صاحب کو آخری مرتبہ دلی میں دیکھا تھا ۔ یہ شاید ۱۹۳۸ء یا اس کے کچھ ماہ بعد کا زمانہ تھا ۔ میں ان دنوں آل انڈیا ریڈیو کے رسالے "آواز" کا ایڈیٹر مقرر ہوکر لاہور سے دلی منتقل ہو چکا تھا ۔ آغا صاحب بھی ان دنوں دلی ہی میں مقیم تھے اور کشمیری دروازے کے قریب ایک مکان میں رہتے تھے ۔ ایک دن ریڈیو اسٹیشن پر سنا کہ آغا صاحب شام کو "کلام شاعر بزبان شاعر" کی قسم کا کوئی پروگرام براڈکاسٹ کرنے آئیں گے ۔ میں بڑے اشتیاق سے ان کا منتظر رہا ۔ آغا صاحب مقررہ وقت پر تشریف لائے ۔ وہ اب نحیف ہو گئے تھے معلوم ہوتا تھا قدم اٹھانا بھی دوبھر ہے چنانچہ وہ اپنے بڑے صاحبزادے آغا آفتاب قزلباش کے کندھے کا سہارا لیتے ہوئے کار سے اترے ۔ اور اسٹوڈیو تشریف لے گئے ۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کی آواز لاؤڈ سپیکر پر سنائی دی ۔ آواز خلاف معمول دھیمی تھی مگر گمبھیر ۔ جوکویا دلوں سے سرگوشیاں کرتی تھی ۔کتنا فرق تھا اس آواز میں جو میں نے بچپن میں سنی تھی اور اس آواز میں جو میں اب سن رہا تھا شاید آواز کے اس دھیمے پن میں تشریات کے قواعد کو بھی کچھ دخل ہو ۔

براڈکاسٹ سے فارغ ہوکر وہ ڈیوٹی روم میں آئے اور وہاں کچھ دیر قیام کیا ۔ وہیں پروڈیوسر نے آغا صاحب سے میرا تعارف کرایا ۔ انھوں نے شاید میری آنکھوں میں وہ عقیدت جھلکتی ہوئی دیکھ لی تھی جو ہمیشہ سے مجھے ان کی ذات سے تھی اس لیے وہ نہایت شفقت سے پیش آئے ۔ اس زمانہ میں وہ اپنے

منظوم ترجمہ قرآن کے ابتدائی پاروں کو دوبارہ طبع کرانے کے لیے بڑے فکرمند معلوم ہوتے تھے ۔ میں نے کتابت و طباعت کے سلسلے میں اپنی حقیر خدمات پیش کیں تو بڑی گلو گیر آواز میں اور پرنم آنکھوں سے میرا شکریہ ادا کیا ۔ مگر افسوس کہ ان پاروں کی طبع ثانی کا کام ان کی زندگی میں تکمیل کو نہ پہنچ سکا ۔ کیونکہ اس ملاقات کے تھوڑے ہی عرصے بعد ان کا انتقال ہو گیا ۔

انا للہ و انا الیہ راجعون ۔

☆ ☆ ☆

مجلس ترقی ادب
کی
چند تازہ ترین مطبوعات

تاریخ خوارزم شاہی
از
غلام ربانی عزیز

کلیات میر
جلد اول و دوم
مرتبہ
کلب علی خاں فائق

تاریخ لاہور
از
کنہیا لال

اندمال

پاکستان کے اس ہوائی اڈے پر اترنے کا احساس بالکل اس احساس سے مشابہ تھا جو آج سے چوبیس سال قبل ، پہلی بار ڈھاکے کے ریلوے سٹیشن پر اترتے ہوئے اس کے دل میں پیدا ہوا تھا ۔ پھر اس دوران میں جلال الدین نے ڈھاکے سے یہاں تک اور یہاں سے ڈھاکے تک کتنی بہت سی پروازیں کی تھیں ۔ پہلے چار گھنٹے کا سفر تھا ۔ پھر تیز رفتار طیارے آئے تو وہ ڈھائی گھنٹے میں مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان پہنچ جاتا تھا ، مگر آج وہ ڈھاکے سے چل کر ڈھائی مہینے بعد مغربی پاکستان کے اس ہوائی اڈے پر اتر رہا تھا ۔ اب کے وطن کے ایک حصے سے وطن کے دوسرے حصے تک پہنچنے کے لیے اسے پورا جنوبی ایشیا طے کرنا پڑا تھا ۔ ڈھاکے سے کلکتہ ، وہاں سے پٹنہ ، پھر کھٹمنڈو — کھٹمنڈو سے بنکاک اور بنکاک سے یہاں! اس نے سوچا بعض آزادیاں بظاہر کیسے ناقابل فہم شارٹ کٹ سے ایک دم آ دھمکتی ہیں مگر اس سے ملک کے ایک قریے سے دوسرے قریے تک کے فاصلے کتنے بڑھ جاتے ہیں ۔

طیارے کی کھڑکی میں سے جلال الدین نے دیکھا کہ سیڑھی طیارے کی طرف لائی جا رہی ہے اور ہوائی اڈے کی دوسری منزل پر ، جنگلے کے ساتھ ساتھ ، لوگوں کی قطاروں کی آنکھیں طیارے کے دروازے پر گڑی ہوئی ہیں کہ کب سیڑھی لگے ، دروازہ کھلے اور اس میں سے ان کے پیاروں کے مانوس چہرے نمودار ہوں ۔

مسافر اپنے اپنے بیگ اور بریف کیس سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے مگر جلال الدین دور جنگلے کے ساتھ لگے ہوئے مردوں اور عورتوں کے چہروں کو بغور دیکھ رہا تھا کہ شاید طاہر کو کسی طرح اس کی آمد کا علم ہو گیا ہو ۔ دور سے ان چہروں کے خطوط واضح نہیں تھے ۔ سب ایک جیسے لگتے تھے ۔ اور پھر اچانک اس کے اندر جیسے ایک انار سا چھوٹا اور سارے چہرے روشن ہو گئے ۔ وہ مسکرانے لگا ۔ وہ ان سب کو جانتا تھا ۔ وہ سب طاہر تھے ۔ وہ سب پاکستانی تھے ۔ اس کے جی میں یہ تمنا امڈ پڑی کہ وہ دروازہ کھلنے کا

انتظار کے بغیر ، کھڑکی میں سے کسی طرح باہر لٹک جائے اور ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا ہوا ، ہوائی اڈے کی دوسری منزل پر پہنچے اور سب سے ایک ایک کر کے لپٹتا چلا جائے ۔

وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور بولا ۔ ''چلو اٹھو عابدہ'' ۔ پھر وہ چونک پڑا اور جھک کر آہستہ سے کہا ۔ ''سب لوگ دیکھ رہے ہیں ۔ آخر یہ کیا تماشا ہو رہا ہے؟''

''تماشا؟'' عابدہ بیگم نے آنسو بھری آنکھوں سے اسے گھورا ۔

''ارے!'' وہ سیٹ پر بیٹھ گیا ۔ ''نزہت بیٹھی تم بھی رو رہی ہو؟''

ایئر لائن کی ایک ہوسٹس نے قریب آ کر بہت میٹھی اور ملائم انگریزی میں ان سے پوچھا ۔ ''میں کوئی خدمت کر سکتی ہوں ؟''

''شکریہ'' جلال الدین گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا ۔ پھر جیسے اس نے طیارے میں اعلان کر دیا ۔ ''ہم مشرقی پاکستان سے آ رہے ہیں ۔ ہمارا نوجوان داماد وہیں کہیں چٹاگانگ میں رہ گیا ہے ۔ وہ رشتےمیں میری بیوی کا بھانجا بھی تھا ۔ ہم پاکستان سے چل کر پاکستان آئے ہیں تو اب میری بیوی کو اپنا بھانجا یاد آ رہا ہے ۔''

''اوہ !'' ایئر ہوسٹس نے اس ایک لفظ میں نہ جانے افسوس کا اظہار کیا یا تعجب کا ۔ پھر وہ نزہت پر جھکی اور آنسو پونچھنے کے لیے اسے اپنا رومال پیش کرتے ہوئی بولی ''مت روؤ پیاری لڑکی ۔ خدا کرے کہ تمھیں تمھارا میاں مل جائے گا ۔'' پھر وہ چونک کر سیدھی کھڑی ہو گئی اور جلال الدین سے پوچھا ''یہ آپ کی بیٹی ہے نا ؟''

''جی'' جلال الدین بولا ۔ ''اس کی شادی چھ سات ماہ پہلے ہوئی تھی۔''

''اوہ!'' اب کے ہوسٹس کے اس لفظ میں واضح طور پر دکھ تھا ۔۔ پھر وہ نزہت کے سامنے جھکی اور بولی ۔ ''میں وعدہ کرتی ہوں پیاری لڑکی ، کہ اگر ہماری ایئر لائن نے ڈھاکے کی سروس شروع کی تو میں وہاں جب بھی جاؤں گی ، تمھارے میاں کو تلاش کروں گی ، اور اسے تمھارے پاس کراچی پہنچا کر دم لوں گی ۔ وعدہ رہا ۔ لو ہاتھ ملاؤ ۔''

نزہت آنسوؤں میں مسکرانے لگی ۔ اس نے بڑے پیار سے ہوسٹس کو دیکھا ، اس سے ہاتھ ملایا ۔ پھر مشین کی سی تیزی سے پرس کھولا اور ایک کتاب میں سے ایک تصویر نکال کر ہوسٹس کو تھما دی ۔

''اوہ ، سویٹ!'' ہوسٹس بولی ۔

"اس کا نام اشرف ہے" جلال‌الدین بولا ۔ "اشرف رضا ۔ جنگ کا بھی کچھ ایسا زور نہیں تھا جب وہ ادھر چٹاگانگ کی طرف دو تین دن کے لیے گیا تھا پر دو تین ماہ تک واپس نہ آیا ۔ ادھر ہمیں اپنی جان کی پڑی تھی ۔ ہم ڈھاکے سے بھاگے اور یہاں پہنچنے میں ڈھائی مہینے اور لگ گئے ۔ یوں سمجھیے کہ اشرف چھ ماہ سے لاپتہ ہے ۔ لائیے میں اس تصویر کے پیچھے اس کا نام اور رہائش محلے کا پتہ وغیرہ لکھ دوں ۔"

"کیوں؟" نزہت نے اشرف کی تصویر ہوسٹس کے ہاتھ سے اچک لی ۔ "یہ تو میری تصویر ہے ۔ میں کیوں دوں کسی کو" ۔ پھر پرس کھول کر تصویر اس میں رکھتے ہوئے بولی ۔ "ایک تصویر امی کے پاس بھی تو ہے ۔ وہ دے دیجیے نا ۔"

تینوں مسکرائے ۔ عابدہ بیگم نے اپنا پرس کھول کر اشرف کی تصویر نکال دی ۔ جلال‌الدین نے اس کی پشت پر ساری تفصیل اور پھر پاکستان میں طاہر کا پتہ بھی لکھ دیا ۔ ہوسٹس نے تصویر لیتے ہوئے اپنا وعدہ دہرایا کہ وہ اشرف کو تلاش کر کے دم لے گی ۔

یکایک جلال‌الدین نے دیکھا کہ طیارہ بالکل خالی ہو چکا ہے اور ایئر لائن کی ایک اور ہوسٹس جو دروازے پر مسافروں کو خدا حافظ کہہ رہی تھی ، وہاں سے فارغ ہو کر ان کی طرف آ رہی ہے ۔ آتے ہی وہ بولی ۔ "معاف کیجیے گا——"

مگر جلال‌الدین نے اسے جملہ پورا نہ کرنے دیا ۔ "ہم معافی چاہتے ہیں ۔ دراصل——————" مگر اب کے پہلی ہوسٹس نے جلال الدین کی بات کاٹ دی اور کسی یورپی زبان میں ہوسٹس سے باتیں کرنے لگی ۔ اس نے اشرف کی تصویر بھی دکھائی ۔ اس دوران میں جلال الدین ، عابدہ بیگم اور نزہت سیڑھی کا نصف طے کر چکے تھے ۔ دونوں ہوسٹسیں لپک کر آئیں اور آخری زینے پر نہایت پیار سے انہیں خدا حافظ کہا ۔

مگر جلال الدین اس آخری زینے پر رک گیا ۔ ذرا سے انتظار کے بعد عابدہ بیگم بولی ۔ "چلیے نا ۔ کیا سوچ رہے ہیں؟"

اور جلال الدین بولا "میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے پاکستان کی زمین پر قدم رکھا تو کہیں یہ مجھے کرنٹ نہ مار دے!" پھر وہ ہنسنے لگا ۔ عابدہ بیگم اور نزہت کے ہاتھ پکڑ کر بسم‌اللہ پڑھی اور زمین پر پاؤں رکھ دیا ۔

سب کے جسموں میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ خوف کی طرح کبھی کبھی مکمل تحفظ کا احساس بھی تو جسم میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔

ایئر پورٹ کی بالائی منزل استقبال کرنے والوں سے قریب قریب خالی ہو چکی تھی مگر ہوا اتنی تیز چل رہی تھی کہ ان کے لباس پھڑ پھڑا رہے تھے اور جلال الدین کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سارا شہر ان سے لپٹا پڑ رہا ہے۔ غیر ملکی ہوسٹسوں نے جس ہمدردی اور انسانیت کا مظاہرہ کیا تھا، اس کے جواب میں جلال الدین کا وطن سے محبت کا جذبہ چاہتا تھا کہ کوئی پاکستانی اس کی طرف بھاگتا ہوا، اسے پکارتا ہوا، بازو پھیلائے ہوئے آئے اور کہے کہ اے میرے بچھڑے ہوئے بھائی! ادھر اس رستے سے آؤ جہاں میں نے تمہارے لیے اپنی آنکھیں بچھا رکھی ہیں۔ آؤ میں تمہیں اپنے کندھوں پر اٹھا لوں۔ لاؤ میں تمہیں اپنے سر پر بٹھا لوں، مگر —— جلال الدین نے سوچا —— یہ ہوائی اڈہ ہے جہاں سب لوگ بہت مصروف ہوتے ہیں۔ آخر کسی کو کیا پتہ کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آ رہا ہوں —— چنانچہ اہل شہر کی بجائے اس نے شہر کی ہوا سے یہ تسکین حاصل کر لی اور عابدہ بیگم اور نزہت سے کہنے لگا۔ ”دیکھا، پاکستانی ہوا کیسے ہمارے کپڑوں میں گھس کر ہمارے گدگدی کر رہی ہے!“ اس پر نزہت یوں مچل کر کلکی جیسے کسی نے سچ مچ اس کی قمیض میں ہاتھ ڈال کر اس کی پسلیوں پر انگلیوں کی پوریں دوڑا دی ہیں۔

ہوائی اڈے پر قدم رکھنے سے لے کر ہوائی اڈے کی عمارت سے باہر آنے تک جو شخص بھی جلال الدین کے سامنے آیا، وہ اسے اپنا شنا سا لگا۔ وہ حیران تھا کہ یہ لوگ اسے دیکھ کر رک کیوں نہیں جاتے، چونک کیوں نہیں پڑتے، ”ہیلو جلال الدین!“ کا نعرہ لگا کر وہ اسے سینے سے بھینچ کیوں نہیں لیتے۔ ”معاف کیجیے گا“، اس نے مجسم مسکراہٹ بن کر لاؤنج میں ایک شخص کو روک لیا تھا۔ ”آپ کا چہرہ جانا پہچانا سا لگتا ہے!“

”مگر ——“ وہ شخص ہکلانے لگا۔ ”مگر —— معاف کیجیے گا، میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔“

”میں ——“ جلال الدین مسکرائے جا رہا تھا۔ ”میں جلال الدین ہوں۔ جلال الدین۔ ڈھاکے سے آ رہا ہوں۔ میرے خیال میں وہیں ڈھاکے میں کہیں آپ سے مل چکا ہوں“۔

”مگر میں تو ڈھاکے کبھی گیا ہی نہیں“ وہ شخص بولا۔ ”آپ کو دھوکہ ہوا ہے۔“ اور وہ جلال الدین کو جیسے ویرانے میں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

''دیکھیے'' ۔ عابدہ بیگم نے ہکا بکا کھڑے جلال الدین کے پاس آ کر کہا ۔ ''لوگوں کو پہچاننا چھوڑئے اور طاہر بھائی کے ہاں پہنچنے کا بندوبست کیجیے۔''

اور جلال الدین ہوائی اڈے کی عمارت سے یوں نکلا جیسے دوسری بار ڈھاکے سے نکل رہا ہے ۔

اس نے جس بھی ٹیکسی ڈرائیور سے چلنے کو کہا ، جواب ملا کہ میٹر خراب ہے ۔ ایک بار اس کا جی چاہا وہ ان سے اپنے آپ کو متعارف کرا دے ۔ اسے یقین تھا کہ اس کے منہ سے ''ہم ڈھاکے سے آ رہے ہیں'' کے الفاظ سن کر ٹیکسی ڈرائیور اسے لپٹا لیں گے ، مگر اب اسے کچھ یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے جب وہ اپنا تعارف کرا رہا ہوگا تو دراصل بھیک مانگ رہا ہوگا ۔

میٹر اس ڈرائیور کا بھی خراب ہی تھا جو چلنے پر رضامند ہو گیا تھا ۔ مگر ساتھ ہی اس نے پندرہ روپے طلب کر لیے تھے ۔

''پندرہ روپے؟'' جلال الدین کو صدمہ پہنچا ۔ ''پندرہ روپے کیسے میاں؟''

''چلیے بیٹھ جائیے نا ابا جی''۔ نزہت آس پاس سے گزرنے والوں کی ٹٹولتی نگاہوں میں گھر کر بولی ۔ ''یہ جا تو رہا ہے دوسروں نے تو صاف انکار کر دیا ہے ۔''

''زیادتی ہے''۔ جلال الدین نے ٹیکسی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا ۔

عابدہ بیگم اور نزہت کو پچھلی سیٹ پر بٹھا کر اور صندوقچی کو گاڑی کی چھت پر رکھوکر وہ ڈرائیور کے پہلو والی سیٹ پر آ بیٹھا ۔ ''چلیے حضور'' وہ بولا ۔

''معلوم ہوتا ہے آپ اس شہر میں پہلے کبھی نہیں آئے ۔'' ڈرائیور نے ایک موڑ کاٹتے ہوئے کہا ۔

''لو! ارےبھائی میں تو درجنوں بار آیا ہوں ۔'' جلال الدین ہنسا ۔ پھر مڑ کر عابدہ بیگم اور نزہت سے کہنے لگا ۔ ''یہ بھائی ہمیں ہمارے میلے لباسوں سے گنوار سمجھ رہا ہے شاید'' پھر وہ ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے بولا ۔ ''ہم ڈھاکے سے آ رہے ہیں بھائی ۔''

''ڈھاکے سے؟'' ڈرائیور یوں حیران رہ گیا جیسے ڈھاکہ مریخ کا کوئی شہر ہے ۔ پھر اس نے کار کو سڑک کے کنارے لے جا کر روک لیا ، سٹیئرنگ پر سے ہاتھ اٹھا کر انھیں جوڑا اور بڑی عاجزی سے بولا ۔ مجھے معاف کر دیجیے بھائی صاحب ۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ وہاں سے آ رہے ہیں ۔ وہاں سے آنے

والوں کو تو ہمیں آنکھوں پر بٹھانا چاہیے - خدا کے لیے مجھے معاف کر دیجیے ورنہ میں کوئی ایکسیڈنٹ کر بیٹھوں گا -"

خوشی کے مارے جلال الدین کی آنکھیں بھیگ گئیں - اس نے ڈرائیور کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے لگا اور پھر ڈرائیور سے یوں لپٹ گیا جیسے ہوائی اڈے پر اترنے سے لے کر اب تک وہ اس کو ڈھونڈھ رہا تھا - پچھلی سیٹ پر عابدہ بیگم اور نزہت مسکرا بھی رہی تھیں اور رو بھی رہی تھیں - ڈرائیور نے آستین سے اپنے آنسو پونچھے، کار سٹارٹ کی اور جیسے اپنے آپ سے کہنے لگا - "ہم بھی کیسے چھوٹے، کیسے کمینے لوگ ہیں جو بھی سواری ملتی ہے ، اسے لوٹنے کی تاک میں رہتے ہیں - یہ سوچنے کی توفیق نہیں کہ یہ جو شخص ٹیکسی لینے آیا ہے ، ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی مر گیا ہو ، یہ اپنے کسی پیارے کے جنازے پر پہنچنا چاہتا ہو ، اس کا بچہ بے ہوش پڑا ہو اور یہ ڈاکٹر سے دوا لینے جا رہا ہو- ہم بھی کیسے بدنصیب لوگ ہیں جو اپنے بچوں کے پیٹ بھرنے کی خاطر دوسرں کے بچوں کے پیٹ کاٹ لیتے ہیں -" ذرا دیر رک کر وہ جلال الدین سے مخاطب ہوا - آپ مجھے معاف نہ کردیتے تو پتہ ہے میں کیا کرتا؟ میں آپ کو پہنچا کر سیدھا ریلوے سٹیشن جاتا اور وہاں کسی گاڑی کے نیچے سر رکھ دیتا -"

"توبہ کرو بھائی ، کیسی باتیں کرتے ہو" ، جلال الدین نے بظاہر بڑی اداسی سے ڈرائیور کا کندھا تھپتھپایا ، مگر وہ اندر سے کتنا آسودہ تھا ا پاکستان آخر اس سے متعارف ہو رہا تھا !

ڈرائیور اپنی دھن میں بولتا ہی چلا گیا - "آپ لوگ ڈھاکے سے آ رہے ہیں جہاں قیامتیں گزر گئیں - پتہ نہیں آپ کہاں کہاں سے لٹ کر اپنے پاکستان . پہنچے اور یہاں میں ——— ایک لٹیرا ——— آپ کی تاک میں بیٹھا تھا کہ آپ کی ہڈی پر اگر کوئی بوٹی رہ گئی ہو تو اسے بھی نوچ لوں - لعنت ہے مجھ پر -"

"اب اور شرمندہ نہ کرو بھائی -" جلال الدین شرمندہ ہونے کی بجائے باغ باغ ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ہم‌وطن بھی کیسا عجیب رشتہ ہوتا ہے - ایک وہ ڈھاکے کے ہم‌وطن تھے ، ایک یہ ٹیکسی ڈرائیور ہے !

مرزا طاہر بیگ کے گھر کے سامنے جب ٹیکسی رکی اور ڈرائیور نے چھت پر سے صندوقچہ اتارا تو جلال الدین نے عابدہ بیگم اور نزہت کے لیے کار کا دروازہ کھولا - پھر اس نے پندرہ روپے ادا کرنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو ڈرائیور نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا - "نہیں صاحب یہ نہیں ہوگا" وہ بولا - "اگر آپ میرے

سینے میں گھونپنے کے لیے جیب میں سے چاقو نکالنے لگے ہیں تو میں آپ کا ہاتھ چھوڑ دوں گا ، لیکن اگر آپ کرایہ نکالنے چلے ہیں تو میں آپ کو یہ نہیں کرنے دوں گا ۔ کرایہ میں نہیں لوں گا ۔ آپ نے مجھے معاف کر دیا تو میرا کرایہ مجھے مل گیا ۔"

آس پاس سے لوگ یہ دیکھ کر جمع ہونے لگے کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور اور ایک مسافر کس بات پر الجھ پڑے ہیں ۔ اچھا خاصا ہجوم ہوگیا ۔ تب طاہر بیگ گھر سے باہر آیا اور جلال الدین کو سینے سے بھینچ کر اٹھا لیا ۔ دونوں ہنس بھی رہے تھے اور رو بھی رہے تھے ۔ پھر جلال الدین نے طاہر کا ہاتھ پکڑا اور اسے عابدہ بیگم اور نزہت کے پاس لے آیا ۔ ابھی دو چار ہی باتیں ہوئی تھیں کہ جلال الدین وحشت زدہ ہوکر پلٹا ۔ ڈرائیور موقع پاکر اچانک ٹیکسی بھگا لے گیا تھا ۔ جلال الدین چند قدم تک اس کے پیچھے بھاگا ۔ پھر رک گیا اور جیسے سارے ہجوم کو مخاطب کر کے بولا ۔ "وہ ایک اصلی پاکستانی جا رہا ہے — سچا اور کھرا! ۔"

طاہر بیگ کے قریب آ کر اس نے سارا واقعہ سنایا ۔ لوگوں نے یہ واقعہ یوں سانس روک کر سنا جیسے الف لیلہ کی کہانی سن رہے ہیں ۔

اچانک طاہر بیگ کو محسوس ہوا کہ مستورات بہت دیر سے محلے کے ہجوم میں کھڑی کھڑی ہیں ۔ "یہ سب میرے محلے دار ہیں ، سب میرے بھائی ہیں" وہ انھیں اندر لے جاتے ہوئے بولا ، مگر پھر رک گیا اور ہجوم سے مخاطب ہوا ۔ "معاف کیجیے گا ، یہ میرے بہت عزیز دوست جلال الدین ہیں ۔ یہ مشرق پاکستان سے لٹ پٹ کر آ رہے ہیں ۔ ڈھائی تین مہینے پہلے ڈھاکے سے نکلے تھے اور اب جانے کہاں کہاں سے ہوتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں ۔ جب آزادیاں ختم ہوتی ہیں تو راستے لمبے ہو جاتے ہیں ۔ یہ لوگ ڈھاکے میں ایک بھرا پرا گھر چھوڑ کر اس صندوقچے کے ساتھ یہاں آئے ہیں ۔" طاہر بیگ نے جلال الدین کے ہاتھ سے صندوقچہ چھین کر اسے بلند کیا ۔

ہجوم میں سے ایک بولا ۔ "شاید انہی کے لیے آپ نے وہ والا فلیٹ کرائے پر لیا ہے؟"

"جی ہاں ، انہی کے لیے" طاہر بیگ نے جواب دیا ۔ "مجھے کھٹمنڈو سے ان کا خط ملا تو میں نے فوراً ایک مکان کا بندوبست کر لیا ۔ یہ سب کچھ میں نے اس لیے عرض کیا ہے کہ اب جلال الدین ابھی یہیں رہیں گے ۔ اگر وہ اس شہر میں رہیں گے ۔ تو پھر اسی کالونی میں رہیں گے ۔ ہم انھیں اور کہیں نہیں جانے دیں گے ۔ پھر میں نے یہ تعارف اس لیے بھی کرایا ہے کہ مشرق پاکستان سے آنے

والے ہمارے بھائی ہم سب کی محبتوں کے مستحق ہیں۔ یہ ایک بھٹی میں سے تپ کر اور کندن بن کر نکلنے والے پاکستانی ہیں۔"

ہجوم میں سے ایک بزرگ بولے۔ "اللہ انھیں برکت دے۔ خدا ہمیں ان کے زخم مندمل کرنے کی توفیق دے۔

اس بات پر نزہت یکایک بچے کی طرح بلک کر رو دی اور جلال الدین اسے سنبھالنے کو لپکا۔ پھر اداس ہجوم منتشر ہونے لگا اور طاہر بیگ تینوں کو اندر لے آیا۔

طاہر بیگ کی بیوی اور بیٹیاں، عابدہ بیگم اور نزہت سے لپٹ لپٹ گئیں اور دیر تک رونے رلانے کا دور چلا۔ پھر سب نے مل کر کھانا کھایا اور طاہر بیگ نے جلال الدین کو بتایا کہ اس وقت اس کے مکان میں مشرق پاکستان سے آئے ہوئے تین خاندان موجود ہیں ورنہ وہ جلال الدین کو اپنے گھر میں رکھتا اور کرایے پر مکان لینے کی ضرورت نہ پڑتی۔ "بہرحال" طاہر بیگ بولا۔ "یہ فلیٹ یہیں قریب ہے۔ بس کوئی ایک پون فرلانگ کا فاصلہ ہوگا۔ دوسری منزل ہے، دو کمرے ہیں، کچن ہے، باتھ ہے۔ بجلی، پانی، گیس سب کچھ ہے۔ تم جب تک یہاں کوئی ملازمت یا کاروبار شروع نہیں کرتے، یوں سمجھو کہ یہ کرایے کا مکان میرا مکان ہے۔ یعنی تمھارا مکان ہے۔"

کھانے کے بعد طاہر بیگ نے ملازم سے صندوقچہ اٹھوایا اور تینوں کو ان کا نیا گھر دکھانے لے چلا۔ یہ تھا تو ایک معمولی سا فلیٹ مگر طاہر بیگ کی محبت نے اسے چمکا دیا تھا۔ تین نئے پلنگوں پر نئے بستر لگے تھے۔ غسل خانے میں تولیہ صابن تک موجود تھا۔ کچن میں تمام ضروری برتن سجے تھے اور سوئی گیس کا نیا چولھا جیسے نئے مالکوں کی خاطر بنا ٹھنا بیٹھا تھا۔ جلال الدین نے یہ سب کچھ دیکھا تو ضبط کے باوجود اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ تشکر کا کوئی لفظ کہنے لگا تو اس کا گلہ رندھ گیا۔ طاہر بیگ نے اسے سینے سے لگا لیا۔ پھر سب کو آرام کرنے کو کہا اور تاکید کی کہ پانچ چھ بجے وہ اس کے ہاں آکر چائے پئیں اور پھر رات کا کھانا کھائیں۔ "جب تک ملازم تمھارے گھر کے لیے ایک مہینے کا سودا سلف بھی لے آئے گا اور میرا سارا گھر کل کا کھانا تمھارے ہاں کھائے گا۔ کیوں نزہت بیٹی؟"

"جی بسم اللہ" ۔ نزہت خوش ہو کر بولی۔

طاہر بیگ کے جانے کے بعد تینوں اپنے اپنے پلنگوں پر جیسے بت بنے بیٹھے رہے۔ پھر جلال الدین نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور پلنگ پر دراز ہو کر بولا۔

"ٹھیک ہے ۔ حالات نے ہمیں لوٹ لیا مگر طاہر نے پورے پاکستان کی نمائندگی کر دی ہے ۔ اس کے برتاؤ نے میرے تو سب زخم مندمل کر دیے ہیں۔"

"سب زخم ابا جان؟" نزہت نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا ۔ پھر آنسو اس کی آنکھوں سے جھلک کر اس کے چہرے پر دوڑنے لگے۔ "سب کے سب زخم مندمل ہو گئے آپ کے ؟ کوئی ایک بھی نہیں بچا؟" رونے پر ضبط کرنے کی خاطر اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا لیا ۔ اس نے پرس کھولا ، اشرف کی تصویر نکالی اور جلال الدین کو دکھاتے ہوئے بولی ۔ "یہ زخم بھی ابا جان؟"

"نزہت بیٹی!" جلال الدین تڑپ کر اٹھا ۔ عابدہ بیگم بھی نزہت کی طرف بڑھی ۔ "اب اپنے آپ کو سنبھالو میری بچی ۔" اس نے نزہت کو لپٹا لیا ۔ پھر دونوں نزہت کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ وہ اس کے سر اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے رہے مگر زبان سے کچھ نہ بولے وہ جانتے تھے کہ نزہت کے زخم کا اندمال مشکل ہے ۔ خاصے وقفے کے بعد عابدہ بیگم کو گفتگو کا ایک موضوع سوجھا ۔ وہ ان غیر ملکی ایئر ہوسٹسوں کی باتیں کرنے لگی جو اشرف کی تصویر لے گئی تھیں اور جنھوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ڈھاکے کی ہر فلائٹ پر اشرف کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گی ۔

"آپ تو میری والی تصویر بھی انھیں دینے لگی تھیں"۔ نزہت نے طنزاً کہا۔ "اگر آپ دے ڈالتیں — اگر آپ مجھ سے یہ تصویر چھین لیتیں تو پتہ ہے کیا ہوتا ؟ میرے لیے اشرف سچ مچ مر جاتا ۔"

نزہت اب کے تو بالکل ٹوٹ کر رو دی ۔ بہت دیر تک جلال الدین اور عابدہ بیگم اسے بہلانے کی کوشش کرتے رہے اور اس کوشش میں خود بھی روتے رہے ۔

پھر جب تینوں طاہر بیگ کے ہاں جانے کے لیے تیار ہوئے اور نزہت نے پرس اٹھا لیا تو عابدہ بیگم نے اسے ٹوکا ۔ "چار قدم پر تو جانا ہے بیٹی ، اور تم پرس لیے آ رہی ہو ۔ کچھ عجیب سا لگتا ہے ۔ پرس کو صندوقچے میں رکھ دو اور صندوقچے کا تالا اتارتی لاؤ ۔ باہر کے دروازے میں لگائیں گے ۔"

نزہت نے ایک پل سوچا ۔ پھر بولی ۔ "جی اچھا"۔ پلٹ کر پرس صندوقچے میں رکھا اور صندوقچے کا تالا کھول کر دروازے تک آئی ۔ تالا لگاتے ہوئے اس کا ہاتھ رک گیا ۔ "امی" وہ بولی ۔ "پرس تو چلو نہیں لاتی ۔ سچ مچ اچھا نہیں لگتا ۔ پر آپ کہیں تو تصویر نکال لاؤں ؟"

"تو تو یہی کچھ پاگل ہو رہی ہے میری طرح" جلال الدین نے اسے پیار سے ڈانٹا ۔ اس کے ہاتھ سے تالہ لے کر دروازے میں لگایا ، چابی جیب میں ڈالی اور تینوں طاہر بیگ کے مکان کی طرف چل پڑے ۔

چائے اور پھر کھانے کی میز پر خوب مزے مزے کی باتیں ہوتی رہیں ۔ طاہر بیگ نے اپنی بیوی بیٹیوں کو سمجھا دیا تھا کہ ڈھاکے کا کوئی ذکر نہ آنے پائے ۔ وہ اپنے شہر کی بھیڑ بھاڑ اور گہما گہمی کی باتیں کرتا رہا اور طاہر بیگ کی اس بات نے تو نزہت تک کو ہنسا دیا کہ جب پہلی بار اس شہر میں آنے والے ایک صاحب ریلوے سٹیشن سے نکلے اور شہر میں داخل ہوئے تو انسانوں اور ٹریفک کے انبوہ کثیر کو دیکھ کر اپنے میزبان سے نہایت معصومیت کے ساتھ پوچھا ۔ "کیوں صاحب یہ شہر خالی کیوں ہو رہا ہے؟"

ملازم شام ہی کو جلال الدین کے گھر کے لیے مہینے بھر کا سودا سلف خرید لایا تھا ۔ عابدہ بیگم اور نزہت کو وہیں چھوڑ کر طاہر بیگ نے جلال الدین اور ملازم کو ساتھ لیا اور سامان پہنچانے فلیٹ کی طرف چلا ۔

فلیٹ میں روشنی ہو رہی تھی ۔ جلال الدین پہلے تو حیران ہوا مگر پھر یہ توجیہہ کرلی کہ عورتیں گھروں کے معاملے میں بہت محتاط اور دور اندیش ہوتی ہیں اور عابدہ یا نزہت نے تالا لگانے سے پہلے بتی جلا دی ہوگی ، مگر جب سیڑھیاں چڑھ کر جلال الدین تالا کھولنے کے لیے جھکا تو ایک لمحے تک جھکا رہا اور پھر نیچے بیٹھ گیا ۔

"کیا ہوا جلال؟" طاہر بیگ نے گھبرا کر پوچھا ۔

اور جلال الدین نے فرش پر سے تالے کے دو ٹکڑے چن کر ہتھیلی پر رکھے اور ہتھیلی کو بلند کر دیا ۔ طاہر بیگ دیوانوں کی طرح دروازہ کھول کر اندر لپکا ۔ پلنگوں پر سے بستر غائب تھے ۔ کچن میں برتن ، چولہے سمیت غائب تھے ۔ غسل خانے میں تولیہ تک غائب تھا ۔ طاہر بیگ اور جلال الدین جیسے سناٹے میں آ کر ایک کمرے کے وسط میں گڑ سے گئے تھے ۔ ملازم مہینے بھر کا سودا صاف ایک کونے میں رکھ کر واپس جا چکا تھا ۔ پھر طاہر بیگ نے جلال الدین کا ہاتھ پکڑا ، اسے محبت سے دبایا اور بولا ۔ "تم کیوں اداس ہو جلال؟ چوری تو میری ہوئی ہے ۔"

جلال الدین کے اندر تب تک دکھ کا ایک طوفان جمع ہو چکا تھا ۔ اس نے طاہر بیگ کو سینے سے لگا لیا اور زور زور سے رونے لگا ۔ اور طاہر بیگ ابھی جلال الدین سے کچھ کہہ نہیں پایا تھا کہ دروازے پر نزہت نمودار ہوئی ۔ وہ

وہاں ذرا سا رکی ، اور پھر ایک پلنگ کی طرف لپکی ۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر وہ پلنگ کے نیچے رکھے ہوئے صندوقچے پر جھپٹی ، اسے اپنی طرف گھسیٹا اور پھر اسے اس وحشت سے کھولا کہ ڈھکنا ٹوٹ کر الگ جا گرا ۔

تب عابدہ اور طاہر بیگ کی بیوی اور بیٹیاں بھی ہانپتی ہوئی آ نکلیں ۔ سب نزہت کی طرف بڑھیں جو صندوقچہ کھولنے کے بعد جیسے پتھر بن گئی تھی ۔

کھلے صندوقچے میں میلے کپڑے جوں کے توں رکھے تھے ۔ صرف نزہت کا پرس غائب تھا ۔

نزہت ، خشک ویران آنکھیں خلا میں گاڑے یوں بیٹھی تھی جیسے وہ ڈھاکے میں بیٹھی مکتی باہنی والوں کے قدموں کی چاپ سن رہی ہو ۔

پھر جلال الدین نے ''بیٹی ، بیٹی'' ، پکارتے ہوئے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور بولا ۔ ''پرس میں کیا تھا بیٹی ۔ تصویر تھی نا اشرف کی ۔ پھر جب خدا کے فضل سے خود جیتا جاگتا اشرف ہمارے پاس سامنے آ جائے گا تو ـــــــ''

''آپ کو پتہ نہیں ابا جی'' نزہت بہت پراسرار انداز میں ، جیسے راز کی کوئی بات بتاتی ہوئی بولی ۔ ''ہم ابھی تک ڈھاکہ میں ہیں ۔ اور اشرف سچ مچ مر گیا ہے اور مارنے والے اس کی لاش بھی اٹھا کر لے گئے ہیں ۔''

☆ ☆ ☆

چینی کا پیالہ

رات بھر پانی جی بھر کے برسا تھا۔ بوندوں کا ایک طوفان دروازوں، کھڑکیوں کے شیشوں سے سر مارتا رہا تھا اور وہ گرجنے والا اس کی خوبیاں پڑھتا رہا - پڑھتا رہا۔ کہ اچانک خاموشی ہو گئی اور بھیگی تاریک ہوائیں تھم گئیں کہ جیسے کوئی رو دھو کر چپ ہو جائے۔ خود ہی— آپ ہی کہ کوئی اس کو چپ نہ کرائے اور وہ خود ہی میلی ہتھیلیوں سے اپنے آنسو خشک کر لے اور ان کی نمک زدہ خاک رخساروں اور ہونٹوں کے گوشوں سے چپک جائے۔ اور وہ خود ہی چپ ہو جائے۔

چنانچہ جب اس نے باہر نکل کے دیکھا تو سامنے میدان میں اور اس کے پیچھے پھیلی پہاڑیوں پر، اور ان کے درمیان لیٹے راستوں پر مٹی کا رنگ کچھ کچھ سبز ہو رہا تھا۔ پس اب پھر وہ مردہ زمین اور کھیتیاں اور پہاڑ اور راستے جی اٹھنے کو تھے اور ہولے ہولے سبز سانس بھرتے تھے۔ اور وہ پاؤں میں رلنے والے سوکھے تنکے اپنی جڑوں کے ساتھ زمین میں کھڑے ہو گئے تھے۔ اور سال ہا سال پرانی خوشبوئیں پھر ویران چکر لگتی تھیں۔ اور کوئی کوئی دن، کوئی کوئی لمحہ مردہ وقت کی کھیتی میں سے اڑتا اڑاتا آتا تھا اور کہتا تھا۔ دیکھو میں آیا ہوں۔ مگر وہ منہ پھیرتی تھی اور اس کو پہچاننے سے انکار کرتی تھی۔ وہ مکھی تھا یا رنگوں بھری تتلی کہ گھوں گھوں کانوں کے گرد گھومتا تھا۔ آنکھوں سے ٹکراتا تھا۔ اور یہ سب کچھ اتنا قدیم تھا کہ تھکا دیتا تھا۔ رلا دیتا تھا۔ اس لیے اس نے ٹیرس کا دروازہ دھاڑ سے بند کیا اور نیچے اتر آئی۔

رات کسی نے میز پر سے برتن نہ اٹھائے تھے اور وہ اسی طرح منہ کھولے پڑے تھے۔ اس نے انہیں سمیٹنے کی خاطر تلے اوپر رکھا۔ اور اس کی نظر اس شکر داں پر پڑی۔ تو پھر یہ موسم آ گیا۔ اس نے دیکھا شکرداں چیونٹیوں سے سیاہ ہو رہا تھا۔ اور اس کا رنگ یوں بدلا تھا کہ اس کی سفیدی تمام کی تمام گہرے بھورے رنگ میں چھپ گئی تھی۔ اور وہ گہرا بھورا رنگ اتنا ساکت تھا کہ شکر داں سے الگ نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے حیرت سے آگے بڑھتا ہاتھ روک لیا۔

"اوں ہوں۔" اماں نے جائے نماز تہہ کرتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

"اوں ہوں۔" وہ اماں کے ہنکاروں کا مطلب بس اتنا ہی جانتی تھی کہ وہ کوئی انتہائی غلط کام کر رہی ہے۔ چنانچہ رک گئی اور کھڑی رہی۔ اماں نے کونٹر پٹر۔ غصہ کے عالم میں جائے نماز تخت پر رکھی اور ہواؤں اور چاروں کونوں اور سینے پر دم کر کے عجلت سے بولیں۔ "ارے بوئی اب اس کو لے کر کب تک کھڑی رہوگی۔ باہر روشنی میں لے جاؤ۔ وہاں کیاریوں کے پاس ذرا دھوپ ہوگی تو خود ہی نکل جائیں گی سب کی سب۔ اتنی بھی عقل مت نہیں۔"

اس نے آہستہ سے شکردان اٹھایا اور باہر چلی آئی۔ ابھی روشنی تھی۔ دھوپ نہ تھی۔ اس نے وہ پیالہ زمین پر رکھ دیا اور اس کے قریب اکڑوں بیٹھ گئی۔ اور بیٹھی رہی۔

وہ گلیاں بھی کیسی تکونی۔ سرخ سرخ۔ چھوٹی چھوٹی اینٹوں سے بنی تھیں کہ جن پر وہ اکڑوں بیٹھ کر گٹے کھیلی تھی۔ کھیلتی تھی اور ہمیشہ ہارتی تھی۔ پتھر کے وہ گھس گھس کر ملائم ہو جانے والے اور رنگ بدل لینے والے گٹے کسی طور اس کے ہاتھ ہی میں نہ آتے تھے۔ اور وہ حیران ہوتی تھی کہ کس طرح وہ پروین، اختری اور زہری کے پھرتیلے، مضبوط ہاتھوں میں دبک جایا کرتے۔ اور گیند تو مانو ان کے ہاتھوں سے جدا ہی نہ ہوتی تھی۔ ایک ڈوری سے بندھی اوپر نیچے اچھلتی رہتی۔ اور اکثر کھیل کے بعد وہ چور آنکھوں سے ان کے ہاتھوں اور پھر گیند کی طرف دیکھتی مگر وہاں تو کوئی ڈوری نہ تھی۔ اور وہ اپنے ہاتھوں کی نااہلی پر اداس ہو جاتی اور گھر کے دروازے کے باہر سیڑھی پر بیٹھ جاتی۔ جب کہ وہ تینوں اسی طرح گلی میں اکڑوں بیٹھی گٹے اچھالتی رہتیں۔ اور وہ پتھر ان کے حکم پر اچھلتے اور گرتے اور سب کچھ ان کی گرفت میں ہوتا۔

"پہلا تھال — ہسپتال —" پروین کو عادت تھی ہمیشہ ایسی ہراساں کرنے والی بات کرنے کی۔ وہ اسپتال کے نام سے ڈر جاتی اور حیران ہوتی کہ گیند اور گٹوں میں اسپتال کا ذکر کہاں سے آ جاتا ہے۔ مگر پروین کے ساتھ ساتھ وہ تھال گائے چلی جاتی۔ اور اس کے بعد دوسرا۔ پھر تیسرا۔ اور اس کے قدرے لمبے اور چوڑے دانت اس کے پتلے پتلے ہونٹوں اندر شام کے پھیلتے اندھیرے میں چمکتے اور اس کی ضرورت سے بڑی آنکھیں۔ سیاہ کالی آنکھیں اور بھی پھیلی پھیلی نظر آتیں۔۔

"بس بھئی بس۔" ایک دم سے اختری پروین کا ہاتھ پکڑ لیتی۔

”بس ۔ بوا جی کہتی ہیں شام پڑے کوئی کھیل نہیں کھیلتے ۔“ اور پھر وہ تینوں سروں پر دوپٹے اوڑھ لیتی ۔ اور یوں جاتیں کہ وہ ان کی پشت پر گھر کے دروازے کے باہر دوسری سیڑھی پر تنہا بیٹھی ان کو دیکھتی ہے اور اس کے پاس کوئی دوپٹہ نہیں کہ جس سے وہ سر ڈھانپے اور ان میں شامل ہو جائے ۔

مغرب کی اذان دھندلی زرد بتیوں اور پاش اڑے دروازوں اور کھڑکیوں کے رنگین شیشوں اور اونچے چوباروں کی خاموش ممٹیوں اور پروں کی سیاہ پھیلی آنکھوں ایسے روشندانوں سے ٹکڑا ٹکڑا کر سارے میں پھیلتی جاتی اور وہ تینوں اس سے پرے ۔ الگ ۔ کچھ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں پڑھتیں ۔ پڑھتیں اور جانتیں کہ وہ تینوں ایک ہی چیز پڑھ رہی ہیں اور اس عمل میں باہم شریک ہیں ۔ اور ایک ہیں ۔ مگر وہ پیچھے اس سیڑھی پر بیٹھی ان کو دیکھتی کہ ان کو معلوم نہیں وہ یہ سب کچھ پڑھنا نہیں جانتی ۔ چاہتی کہ ان سے کہے کہ اونچا بولو ۔ مجھے بھی بتاؤ کہ میں بھی پڑھوں اور تمہارے ساتھ حفاظت کے اس حصار میں چلی آؤں ۔ اور خوف کی نرم نرم ہوائیں چاروں سمت اس کے گرد بہنے لگتیں اور وہ اتر کر ان کے قریب آ جاتی ۔ اذان ختم ہو چکتی ۔

”چلو آؤ بجھارتیں ڈالیں ۔“ اختری کہتی اور سب کی سب اب گلی چھوڑ کر دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتیں ۔

”پہلے تم ڈالو“ زہری شاید اس کا اکیلا پن محسوس کر لیتی اور اس کو اپنوں میں شامل کرنے کو کہتی ۔ مگر اسے تو بس وہی ایک پہلی ہی آتی تھی جو ہونٹوں سے نکلنے سے پہلے ہی لوگ پکڑ لیتے ۔

”مجھے تو نہیں آتی ۔“ وہ اس گھسی پٹی بجھارت سے بچنے کی خاطر کہہ دیتی ۔ ”ہا ۔ بیچاری ۔ اس کو تو کوئی کھیل بھی نہیں آتا ۔“ اختری ترس کھاتی ”لیٹس ۔ یہ بات لیٹس ۔ اس کا انگریزی اسکول ہے نا ۔ واں بجھارتیں نہیں ہوتیں ۔ مجھے بھابھی جی نے بتایا ہے ۔“

زہری نامعلوم کیوں ہمیشہ اس کی طرف داری کرتی تھی ۔ جب شہتوت کے درخت پر چڑھتی تو نیچے کھڑے سب لوگوں میں سے پہلے اسی کو پکارتی ۔

”جھولی کر ۔ جھولی ۔ توت کھانے کی نا ۔“ وہ فوراً اپنے فراک کا چھوٹا سا دامن پھیلا دیتی ۔ اور زہری پکے پکے شہتوت ۔ سیاہ ، بھرے بھرے ، لپ لپ ۔ اس جھولی میں گرائے جاتی اور جب تک وہ خود بس نہ کہتی وہ اپنے منہ میں ایک دانہ بھی نہ ڈالتی ۔

''اچھا بس کر اور —'' اور پھر وہ اونچی اونچی ٹہنیوں میں کھڑی —دونوں ہاتھ چھوڑ کر — بازو لمبے لمبے کر کر کے خوب خوب شہتوت توڑ توڑ کے کھاتی ۔ اور ساتھ میں گانے جاتی ۔ جھنڈا اسلام کا لہلہاتا رہے ۔ اور گاتے گاتے رک جاتی ۔ پھر ایک دم سے اونچے تنے سے چھلانگ مار دیتی ۔

''تم بھی سکول میں گاتی ہو نا ۔ جھنڈا اسلام کا —'' وہ اپنے دوپٹے کا جھنڈا بنا کر لہراتی ۔

''نہیں —'' وہ بےحد شرمندہ ہو جاتی —''ہم تو وہ گاتے ہیں ۔ ون فٹ اپ اینڈ ون فٹ ڈاؤن —''

''چلو چلو — کوئی بات نہیں ۔ وہ بھی اچھا ہے ۔'' وہ دوپٹہ کس کے کمر کے گرد باندھ لیتی ۔

چلو لکن میٹی ۔'' وہ نعرہ لگاتی ۔ اور پھر سب کی سب گلی کے دروازوں اور کھمبوں اور پیڑوں کے پیچھے چھپنے لگتیں ۔ اور کسی دیوار کے کونے سے لگے، اس کا دل دھڑک دھڑک کے گلے میں آ جاتا اور کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگتیں۔ وہ کس کو ڈھونڈے گی—؟ اور عین توقع کے مطابق وہ سب کو ان دیکھتی آنکھوں سے دیکھتی ۔ بالآخر ان کو آن پکڑتی ۔

''چھوا''

وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایک دم اچھل جاتی ۔ اور پھر وہ ہاتھوں میں ہاتھ دیے ساری گلی میں بھاگتی پھرتیں ۔ اب وہ دونوں ہوتیں ایک ساتھ —— اور باقی سب الگ ہو جاتیں ۔ زہری کا ہاتھ مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھامے ہوتا اور اس کا یہ ہاتھ سخت ہوتا ۔ کھردرا ، محنتی ۔ جس کی ایک انگلی میں پیتل کا چھلا چھبتا اور اس کے چپکے چپکے بالوں اور چیکٹ پراندے میں سے سرسوں کے تیل کی بو آتی اور ہنستی تو سفید دانتوں کے گردا گرد دنداسے کا گہرا بھورا رنگ پھیلا ہوتا ۔ بالکل اس شکردان کی طرح ۔

پھر وہ سب کی سب سیڑھیوں پر بیٹھ جاتیں کہ اس وقت شام گزر چکتی اور اب رات کی صدائیں گلی میں اڑتی پھرتیں ۔ لوگ دروازے کھڑکھڑاتے ۔ مانگیں اور چارپائیاں اندر کرتے ۔ کوئی کھڑکی کھلتی کوئی بند ہوتی اور انہیں معلوم ہوتا کہ ابھی ان کا نام پکارا جائے گا اور سب کو اس گلی کو چھوڑ کر اڑ جانا ہوگا ۔ ایک ہی پکار پر ، چپ چاپ ، سر جھکائے ، بغیر کسی حجت کے ۔ کہ یہ نام کا پکارا جانا اٹل ہے ۔

بجھارتیں ڈالو ۔"

زہری پھر سب سے کہتی اور یہ شام کا آخری کھیل ہوتا اور سب کے جسم تھکن سے اور دل اداسی سے بوجھل ہوتے اور ایک لمبی رات سامنے پڑی ہوتی ۔

"آر ٹانگاں—پار ٹانگاں—" اختری ایسی بوجھل پہلی کہتی کہ اس کی آوازوں میں وہ بھٹک بھٹک کر سر ٹکرا ٹکرا کر رہ جاتی اور اس کی بوجھ وہ دونوں باقی کی لمحے بھر میں یک زبان بتا دیتیں ۔ جو اس کی سمجھ میں کبھی نہ آتی کہ اس نے کبھی کنواں نہ دیکھا تھا ۔ پانی سے بھرا ، شاداب ، نیچا گہرا کنواں ، نہ خالی سوکھا کنواں اور نہ ہی وہ کونجیں ۔

تب زہری وہ آخری بجھارت ڈالتی کہ جس کے بعد اور کوئی بجھارت نہ آتی کہ دراصل اس کے بعد کوئی بجھارت تھی ہی نہیں جو آتی ۔ وہ گویا اس بجھارت کی سیاہ چادر ایک جھٹکے کے ساتھ تمام زمین و آسمان پر ڈال دیتی اور خود ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس سیڑھی پر ، ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی رہتی ۔

چینی کا پیالہ ٹوٹ گیا کوئی جوڑن والا نئیں
سر کاروں جندرے وج گئے کوئی کھولن والا نئیں

اس کا سر ایک دم خالی خولی اِدھر اُدھر گھومنے لگتا اور اداسی کی اکائی اس کے گلے میں آن پھنستی اور گلی میں چلنے والے اکا دکا لوگ ۔ اور منڈیروں پر منڈلاتی بھٹکتی آوازیں ۔ سب ساکت ہو جاتیں ۔ رک جاتیں ۔ ٹھہر جاتیں ۔ اک سیاہ چادر تلے ۔ پھر گھر کی کھڑکی سے آواز بھاری پتھر کی طرح ان کے قدموں میں آن گرتی ۔

"زہری او زہری ۔" اور تمام در و دیوار پکارتے ۔ "زہری او زہری" "چلو ۔ چلو ۔" اس پکار پر وہ سب کی سب لبیک کہتیں ۔ اور پروین اور اختری اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتیں ۔ زہری وہ تنگ زینہ چڑھنے لگتی اور اس کے پیچھے—قدم قدم وہ—یہاں تک کہ زرد بتی کی روشنی سے بھرے صحن میں وہ جا پہنچتیں ۔ اور وہاں سامنے چولھے کے پاس برتنوں کا ڈھیر اور راکھ بھرا پیالہ زہری کے منتظر ہوتے ۔ اور بڑی اماں اور بڑے ابا اس بڑے اونچے موٹے موٹے رنگین پایوں والے پلنگ پر بیٹھے ہوتے ۔ بڑی اماں کے ہاتھ میں خلال ہوتا اور بڑے ابا لونی کی نکل مارے حقے کی نے منہ میں گڑگڑاتے ۔ کھسر ۔ کھسر ۔ زہری

کے محنتی ہاتھ ہتھیلیوں پر راکھ گھستے اور وہ اسی خوف میں رہتی کہ ابھی اس کا وہ پیتل کا چھلا ہتھیلی کے ساتھ رگڑ کھا جائے گا اور وہ جسم میں سرسرا جانے والی آواز آئے گی ۔ اسی انتظار میں وہ بڑے ابا کی بغل میں دبے دبے سو جاتی ۔

تو جب اس کے باپ سے پوچھا گیا تو اس نے حسبِ دستور ماتھے پر ایک موٹی سی تیوری ڈالی اور سر کو جھٹکا اور حقہ اٹھا کر باہر چل دیا ۔ ''مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا یہ کیا کہے گا ۔ اس نے کبھی آج تک اولاد کو اولاد سمجھا ہو تو جب نا ۔'' بڑی اماں نے بھنا کے کہا ۔ ''بس کر دو جی ہاں ۔ بن ماں کی ہے ۔ میں کب تک اس کی دیکھا بھالی کروں گی ۔''

اور گرمیوں کی انہی چھٹیوں میں زہری نے گٹے کھیلنے سے ہاتھ اٹھا لیا اور شہتوت کے درختوں پر چڑھنا بند کیا ۔ کیونکہ اس کی شادی لمبوترے چہرے اور بھورے بالوں والے ایک شخص سے ہو رہی تھی کہ اس کی گردن پتلی سی اور لمبی تھی اور جب وہ بولتا تھا تو اس کی آواز بمشکل گلے سے کھلتی تھی اور گردن کی رگیں پھول پھول کر پھٹنے کو آتی تھیں اور چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں باہر کو اُبل پڑتی تھیں ۔

زہری بہت خوب صورت ہو گئی تھی اور اماں کے ساتھ لگی رات دن کپڑوں پر گوٹا اور ستارے ٹانکتی تھی ۔ پھر ایک دن تین چار تانگوں میں بیٹھے کچھ لوگ آئے اور سرخ کپڑے پہنے زہری خود اپنے پاؤں چلتی ان کے ساتھ رخصت ہو گئی ۔ اور بڑی اماں اور اماں دونوں نے سکھ کا سانس لیا کہ وہ اس کی ذمہ داری سے آزاد ہوئیں ۔ چھٹ گئیں ۔ کٹ گئیں ۔ اب ان کا کیا واسطہ اس سے ۔ اور اس کے باپ کا بھی اس سے کوئی واسطہ نہ تھا ۔ اور اس کی ماں کا بھی اس سے کوئی واسطہ نہ تھا کہ وہ مٹی تلے دبی غافل سوتی تھی ۔

پھر عرصے بعد جب اب کے وہ آئی تو ایک ان دیکھی آڑ ان دونوں کے درمیان تھی ۔ اس نے اس کو دور سے دیکھا اور نہ پہچان پائی کہ یہ وہی زہری ہے جو گٹے کھیلتی تھی اور درختوں پر سے شہتوت گراتی تھی ۔ اور اچانک اس کو آن پکڑتی تھی ۔ وہ چپ چپ تھی ۔ سیانی ہو گئی تھی ۔ اور اماں کے ساتھ زیادہ باتیں کرتی تھی اور ان دیکھتی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھتی تھی ۔ اور کچھ کچھ دیر بعد آنسو اس کی آنکھوں سے ابل ابل کر رخساروں پر بہہ نکلتے تھے ۔

''بی بی ۔ اب تمہارا وہی گھر ہے ۔ شاباش دل چھوٹا نہیں کرتے ۔'' اماں نے گھرر گھرر مشین چلاتے ہوئے کہا ۔ اور زہری نے حسرت سے اس گھر کے

در و دیوار پر نظر کی - پھر اپنے دوپٹے کو سہلانے لگی - مگر اس کی آنکھوں کے آنسو نہ چھپے - اور وہ اس کے آنسو دیکھ کر فوراً دروازے کے پیچھے چھپ گئی کہ کسی کو خبر نہ ہو کہ اس نے یہ آنسو دیکھے - کم از کم زہری نہ جانے کہ کبھی وہ ان آنسوؤں کی شہادت میں نہ پکڑی جائے -

دوسرے کمرے میں وہ لمبوترے چہرے اور بھورے بالوں والا شخص بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ تین چار اور بھی اور بڑے ابا ان کے درمیان بیٹھے تھے - اور سب بڑھ چڑھ کے بول رہے تھے - تب بڑے ابا نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا - اور وہ دروازے کے باہر کھڑی اندر کی اونچی اونچی گرجتی برستی آوازیں سنتی رہی -

مگر اماں نے زہری کو وہ سیاہ ریشمی برقع پہنا دیا -" اور دوسرے کمرے سے اس کا آدمی آیا اور بولا - ”چل بھئی چل -“ پھر ذرا رکا اور بولا -

”اور کیا کیا بتاؤں بھابی جی - ایک تو میں اس کے پاس بیٹھتا ہوں-تو جیسے اس کو گولی لگتی ہے -“ اس نے گلے کی رگیں پھلائیں -

”نا نا — اے زہری — پتہ ہے فرشتے لعنت کرتے ہیں تمام رات -“

یہ بھی فرشتوں کی کتنی زیادتی تھی کہ زہری ہی کو لعنت کرتے - اس کی سمجھ میں یہ بات قطعی نہیں آئی - اور زہری ایک معتوب و ملعون چیز، سیاہ برقعے میں لپٹی چلی گئی - چلی گئی اور کچھ عرصے بعد اس کے گھر کی طرف سے ایک چھوٹا سا لڑکا دوڑا آیا - اور اماں سے بولا - ”زہری بیمار ہے بہت - آپ کو یاد کرتی ہے -“

اماں نے اس کے باپ سے کہا - ”زہری بیمار ہے تم کو یاد کرتی ہے - جاؤ اس سے مل آؤ -“ اور اس کے باپ نے ایک موٹی سی شکن ماتھے پر ڈالی اور حقہ بغل میں داب گھر سے نکل گیا - اور اس نے شہتوت کے درختوں اور گلی کے کھمبوں سے کہا - زہری بیمار ہے بہت - تم کو یاد کرتی ہے - مگر سب خاموش کھڑے رہے - ساکت - اور اس نے پاؤں میں رلتے پتھروں سے کہا - زہری بیمار ہے بہت - تم کو یاد کرتی ہے - مگر سب پڑے منہ تکا کیے -

پھر کئی مرتبہ ہوائیں اور ان ہواؤں کی خوشبوئیں اور رنگ بدلے اور کئی مرتبہ دالان میں لحاف بچھے - ان کے ڈورے ادھیڑے گئے - اور پھر ان میں دھنی ہوئی بادلوں کی سی روئی ڈال ڈال کر ڈورے ڈالے گئے - اور اماں چھڑی مار مار کے روئی کو لحافوں میں برابر برابر کرتیں رہیں - اب وہ محض کنارے پر

بیٹھ کر منہ نہ دیکھتی بلکہ اماں ایک بڑی نوکدار سوئی اس کے ہاتھ میں بھی تھما دیتیں۔ اور ٹانکا چھوٹا اور سیدھا رکھنے کی ہدایت کرتے ہوئے اس کو بھی کام میں لگا دیتیں۔ اور سب کے سب بھول چکے تھے کہ زہری کہاں اور کیسی ہے۔

تب ایک ایسی ہی رات ایسے ہی پانی جی توڑ کے برسا تھا۔ اور دروازوں کے شیشوں اور کھڑکیوں ساتھ سر پٹکتا تھا۔ وہ گرجنے والا اس کی خوبیاں پڑھتا تھا کہ پھر یکدم سناٹا ہو گیا۔ بھیگی تاریک ہوائیں تھم گئیں۔ جیسے کوئی رو دھو کے خود ہی چپ ہو جائے۔ خود ہی چپ ہو جائے کہ کوئی اس کو چپ نہ کرائے اور وہ میلی ہتھیلیوں ساتھ آنسو خشک کر کے خود ہی چپ ہو جائے۔

چنانچہ بھیگی بھیگی دھوپ چڑھے پھر ایک عورت زہری کے گھر کی جانب سے دوڑی چلی آئی اور سر کا برقع اتارے بغیر بولی۔

”بہت بیمار ہے زہراں۔ بدنصیب نے کسی کے کہنے پر کھانسی بخار دو کرنے کو مٹی کا تیل پی لیا ہے۔ اور اب خون الٹ رہی ہے۔ خون — کڑاہیاں بھر گئی ہیں بی بی جی —“

وہ دروازے کے پیچھے کھڑی سنتی تھی۔ اور اس نے چاہا کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے کہ انصاف کے دن ان کو شہادت میں پکڑا جائے۔ مگر اس کی انگلیاں اپنی جگہ پر پتھر بنی ساکت رہ گئیں۔

”اماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اس کے باپ کو پکارا جو باہر گیٹ پر زمین پر اکڑوں بیٹھا حقہ گڑگڑاتا تھا۔

”ماما — او — ماما۔“

مگر وہ حقہ بغل میں داب اٹھ کر چل دیا۔ اور اماں ایک اور آہ بھر کے پھر چاول چننے لگیں۔ اور شام ڈھلے معتوب و ملعون زہری کی جانب سے آخری ہرکارہ آیا کہ جو اس نے خود نہیں بھجوایا تھا۔

”او بیوقوف! تو کیا ریسرچ کر رہی ہے۔“ اچانک امتیاز ہاتھ میں ریکٹ لہراتا آیا۔ وہ چینی کے پیالے کے قریب اکڑوں بیٹھی تھی۔ بیٹھی تھی مگر اب کھڑی ہو گئی۔

”اس طرح جائیں گی یہ—؟“ امتیاز نے جھک کر کہا۔ اور پھر پاؤں سے دھیرے سے ٹھوکر ماری پیالے کو۔

"ناشتہ کا وقت ہو گیا ہے ۔ دیر کرائے گی سب کو ۔"

ٹھوکر ہر وہ رزق سے چپکی مخلوق ، حقیر ، معتوب مخلوق ایک بھگدڑ میں پڑ گئی ۔ وہ اپنی کائنات کے کناروں کناروں تک بھاگ اٹھی ۔ اس نفسا نفسی کے عالم میں ایک دوسرے سے ٹکراتی ، ایک دوسرے کو روندتی ، کہ چاہتی تھی کہ اس کائنات کے دوسرے کنارے تک پہنچ جائے کہ ان تمام امکانات سے نکل کر کسی اور حصار میں جا بسے — کہ آج کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھا رہا تھا ۔

"او ایڈیٹ ۔ اس پیالے کو کھڑ کھڑا — زور سے — یوں —" امتیاز بری طرح جھلا رہا تھا ۔

"اس طرح —" اس نے پیالہ اٹھا کر زمین کے ساتھ کھڑ کھڑایا ۔

اور وہ کھڑ کھڑانے والی — تم کیا جانتے ہو وہ کھڑ کھڑانے والی کیا ہے ؟ وہ بلند کو پست اور پست کو بلند کر ڈالنے والی — کوٹ ڈالنے والی — وہ معتوب اور امتحان میں ڈالی گئی مخلوق اندھا دھند بھاگ رہی تھی اور اس پیالے کے کناروں سے نکل جانے کی دھن میں تھی — کہ پیالے میں دراڑ پڑ گئی — ایک ۔ دو ۔ نہیں بہت سی اور وہ الگ الگ ٹکڑوں میں بکھر گیا — مٹی بن گیا — اور مٹی تنہا رہ گئی ۔ وہ مخلوق جا چکی تھی ۔ کہیں اس کا نام و نشان نہ تھا اور نقش پا بھی نہیں ، نہ ہی کوئی اس کی آہٹ سنائی دیتی تھی ۔

☆ ☆ ☆

میں — ایک بچہ

مدتوں سے میرے دل پر ایک ابدی موسم گرما حکمران ہے
میرے دل میں سچائی کی دھوپ کا سیلاب آیا ہوا ہے
میری روح کی کلیاں کھل رہی ہیں
میرے باغ میں رنگ ہی رنگ ہیں اور مہک ہی مہک ہے
اور ہر طرف پرندے چہچہا رہے ہیں

میرا دل ہر زندہ انسان کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہے
تاکہ چار سو ہواؤں کے دوش پر سوار ہوکر
میری محبت چار طرف پھیل جائے
میں نے اپنی روح ، تمام گمشدہ روحوں کے نام منسوب کر دی ہے
تاکہ زندگی زیادہ واضح ، زیادہ آسودہ ہو سکے

مدتوں سے میں ہزاروں گھرانوں کا ایک بچہ ہوں
ہزارہا مایوس بچوں سے چھوٹا
اور ہزاروں چیتھڑے لگے بچوں سے بڑا
جو گھریا انگیٹھی یا محبت یا رحم سے محروم
دنیا بھر میں آوارہ ہیں

کلوم اپولی نیر

عزیز حامد مدنی

بانکے کا قرنا[1]

ہماری داستاں تمثالِ غم تھی
کسی کردارِ اعلیٰ کی جھلک تھی
شرف آثار تھی ، کہا محترم تھی

نہ تھی یہ ہر خطر جادو کی تمثیل
نہ فصلِ واقعات نو بہ نو تھی
وفا کی درد ہجراں سے تھی تشکیل

کہیں پرچھائیوں کا سلسلہ سا
وہ موج افیون کی بے داغ و شیریں
جوڑی کینسی کے دل میں کاڑھتی تھی
ہزاروں خواب کا ایک سلسلہ سا

مگر یہ سلسلہ بھی کم ہی ٹھہرا
جو ٹھہرا بھی تو ایک دو دم ہی ٹھہرا

غباروں میں بکھر جاتی ہیں آخر
کسی بانکے کی آوازیں ہیں یادیں
ہوا کی رو میں مر جاتی ہیں آخر

۱ کور دشیامی—بانٹنگ بارن۔

رپرٹ برک

جابر علی سید

'سپاہی'

اگر میں جنگ میں کام آؤں تو اتنا سمجھ لینا
کہیں اک رزم گہ دور افتادہ ہے جس کے ایک گوشے میں
دل انگلستان کا پیہم دھڑکتا ہے !
وہاں کی خاک میں ہے ایک خاک خوب تر پنہاں
جسے پیدا کیا ، پالا بڑھایا انگلستان نے
شعور و عقل و جاں دے کر
جسے پھولوں سے الفت رہگذاروں سے محبت تھی
جو انگلستان کی روشن فضا سے تھا نمو آگیں !
وہاں کی ندیوں سے شستگی ، سورج سے تابانی ملی اس کو
وہ دل اک رزم گہ دور افتادہ کے گوشے میں
وطن کے حسن کی تصویر سے رنگین ہے یکسر
الٰہی جذبات کا مرکز جو بخشے تھے وطن نے اس کے پیکر کو
وہ پیکر اب بھی ہے اس کی صداؤں کا نظاروں کا
طرب انگیز خوابوں ، قہقہوں کا دوستوں کی بزم رنگیں کا
متیں شائستگی کا اک وقار آگیں دل حساس کا مظہر
وطن کے حسن کا اس کے زمیں و آسماں کا پیکر تاباں !

کاسمو پانٹرس (جنوبی افریقہ)

امجد اسلام امجد

میں ایک دل کی ترنگ ہوں

میرا دل نازک اور کمزور ہے
ایک ایسا دل جو شدت غم سے بہت جلد گھبرا جاتا ہے
جب میں کہتا ہوں کہ میرا دل نازک اور کمزور ہے
تو اس سے میری مراد یہ ہے کہ میں اکثر دکھ کے عالم میں رو پڑتا ہوں

ایک دن یہ دل اس شدید غم کے بوجھ سے ٹوٹ کر خاموش ہو جائے گا
اکثر خاموشی اور خود شناسی کے لمحوں میں
میں اپنے دل کی کمزوری پر روتا ہوں

اس وقت ہر طرف خاموشی ہے
اور تنہا سائے کونوں میں جمع ہو رہے ہیں
اور کونے کمرے پرچھا رہے ہیں
اور کمرہ میرے گرد پھیلتا جا رہا ہے
میرا دل نازک اور کمزور ہے
اور میرا کمزور دل کونوں میں جمع ہوتے خاموش
اور تنہا سایوں سے بہت گھبراتا ہے

لیکن یہ میرے دل کی ہیئت ہے جو اہمیت رکھتی ہے
نہ یہ کہ وہ کس حالت میں ہے
اور نہ یہ کہ اس کا حجم کتنا ہے
اور تم ہمیشہ میرے لیے بچے ہو میرے پیارے حجتی!
یہی وجہ ہے کہ جب میں کسی نوجوان کو
موت کی آغوش میں سمٹتے ہوئے دیکھتا ہوں
تو میں چلا اٹھتا ہوں
کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں میرے ننھے بچے!
اور میرے لین بچے ہیں :

میرا دل نازک ہے لیکن جب وہ مجھ سے پوچھیں گے
'کیا تم مرنے کے لیے تیار ہو'
تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا
کیونکہ میرے دل کی شکل کا ایک پورا براعظم ہے

اور جب میں بچوں کو خوابیدہ دیکھتا ہوں تو اگرچہ
میرا دل کمزور ہے ، میں جانتا ہوں
کہ یہ میرا کمزور دل ہی ہے جو مجھے ہمیشہ
موت کے استقبال کے لیے سربکف رکھتا ہے

☆ ☆ ☆

خاطر غزنوی

غزل

عجیب دیکھا ہے پھولوں کا اس چمن میں نظام
کہ انتظار طویل ان کا ، مختصر ہے قیام

حسین تر ہے گلوں کی بہار کا عالم
ترے بغیر مگر پھول بھی ہیں زہر کے جام

قبول تیری جدائی میں تا ابد نہ کروں
قضا کے ہاتھوں میں لیکن ہے زندگی کی زمام

وجود میرا ہے گو سب کے سامنے موجود
نہ جان و دل ہیں وہاں ، ہے جہاں مرا گلفام

لب آشنائے تبسم ، نہ خواب آنکھوں میں
ہیں کشتگان محبت پہ یہ تمام حرام

وہ خاک عنبر و گلگونہ سے بھی بہتر ہے
کہ جس پہ ہو وہ مرا گلعذار محو خرام

توقع چشم میں مست سے کسی کی غلط
کب ایسے آہوئے صحرا ہوئے کسی سے رام

ہمیشہ اوروں نے خالی کیے سبو بھر بھر
ہے اک پیالے پہ خوشحال خان مگر بدنام

نامعلوم

میر خدا بخش بجارانی مری

نظم

ایک دن آسمان پر ابر چھا کر سایہ افگن ہوئے
کئی جگہ بادل گھنے تھے اور کئی جگہ معمولی
اے برسنے والے بادلو تم سے ایک گزارش ہے
کہ تم لرمکھ کے آباد علاقے پر برسو
تاکہ پہاڑی ندی نالے بہہ نکلیں
اور پانی بندوں سے اوپر چڑھ جائے اور گڑھے بھر جائیں
کونج جیسی خوبصورت چال والے معشوق جب صبح اٹھ کر آئیں
تو وہ مرغزاروں سے کونجوں کی طرح قطار در قطار پانی پر جمع ہو جائیں
اور تھوڑی دیر وہاں رہ کر واپس چلے جائیں
تب کبوتر جمع ہوکر ان کے کندھوں پر بیٹھیں
وہ حسن افزا مرکب تیار کرکے اپنے چہروں پر ملیں
جنھیں وہ بڑی احتیاط سے بنا کر رات بھر رکھتے ہیں
تمہارے ہاتھ کی انگوٹھیاں سونے کی ہیں
جنھیں ستاروں نے نہایت خوبصورتی سے بنایا ہے

تمھارے ناک کی نتھ سونے کی ہے جس میں موتی جڑے ہیں

یہ بات سارے جہان میں مشہور ہے

نزدیک ہو اے محبوبہ تاکہ میں بھی تمھاری خوشبو

سے اپنا حصہ لوں

✡ ✡ ✡

رفتار ادب

(تبصرے)

مجلہٌ علم و آگہی (خصوصی شمارہ) قائداعظم محمد علی جناح ۱۹۷۶ء (گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی) اس رسالے کے مرتبین ڈاکٹر انصار زاہد، پروفیسر فصیح الدین صدیقی اور ابو سلمان شاہ جہان پوری ہیں۔ رسالے میں ملک کے اربابِ علم کے مضامین اور مقالات قائداعظم کی حیات و افکار سے متعلق جمع کر دیے گئے ہیں کچھ نظمیں بھی نظر آتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ رسالہ ایک اہم دستاویز کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ رسالہ میں کہیں کہیں طباعت کی غلطیاں بھی رہ گئی ہیں۔ آغاز میں "جنگ آزادی اور مسلمان" جو مضمون ہے وہ نامکمل سا ہے۔ اشرف علی خاں فغاں کوکہ احمد شاہ بادشاہ کا ذکر میر کے ساتھ غلط ہے۔ وہ افغان قبیلے زنگنہ سے تعلق رکھتے تھے۔ بقول قاضی عبدالودود کے۔ "نظریہٌ پاکستان کا سفر" مختصر مضمون اچھا ہے۔ "تصورِ پاکستان کی ایک گم شدہ کڑی" نظریہٌ پاکستان سے متعلق اہم دستاویزی ثبوت ہے۔ اسی طرح "تحریک پاکستان کا ایک گم شدہ ورق" معلومات افزا مضمون ہے۔ "قائداعظم اور تحریک خلافت" اس مضمون میں یہ بحث کی گئی ہے کہ تحریک خلافت سے قائداعظم کا علیحدہ رہنا کس بنا پر تھا۔ وہ ملی درد ضرور رکھتے تھے لیکن کسی ایسی تحریک میں شامل ہونا گوارا نہ کرتے جس کی قیادت ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہو۔ "قائداعظم اور مسلم لیگ" اور "مسلم لیگ اور تحریک بقائے اردو" میں مقالہ نگار حضرات نے وہ وجوہ ظاہر کیے ہیں جن کی بنا پر مسلم لیگ نے عملی قدم اٹھا کر مسلم عوام تک اپنا پیغام پہنچایا۔ "قائداعظم اور مسلم معیشت" میں مضمون نگار نے بحث کی ہے کہ قائداعظم نے مسلمانوں کی معاشی بدحالی دور کرنے کے لیے کیا بیانات دیے ہیں۔

"قائداعظم — ایک سماجیاتی جائزہ" میں ثابت کیا ہے کہ قائداعظم جانتے تھے کہ ہندو اور مسلمان دو علیحدہ اقوام ہیں جو اپنے عقائد اور رسوم و رواج میں ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں خصوصاً مذہبی عقائد میں دونوں میں تضاد ہے اسی لیے جدا وطن کا مطالبہ ضروری تھا۔ ایک غیر مطبوعہ مضمون

مولانا غلام رسول مہر مرحوم کا بہ عنوان ''قائداعظم—انداز فکر پر ایک نظر'' بھی شامل ہے - ''۱۹۴۵ء کا تاریخی الیکشن'' اہم فہرست ہے - حیات و سوانح کے تحت میں جداگانہ حصہ مخصوص ہے جس میں مختلف مقالہ نگار حضرات کے مقالات شامل ہیں (از صفحہ ۱۵۱ تا ۲۹۰) - ''حیات و افکار'' ، ''سرگذشت قائداعظم جناح'' ، ''قائداعظم کی جائے پیدائش''، ''ایک نادر روزگار شخصیت'' ، ''قائداعظم محمد علی جناح''، ''قائداعظم کی بیماری کے ایام''، لاہور میں قائداعظم کی قیام گاہیں'' ، ''قائداعظم کی لائبریری'' ، ''قائداعظم اشعار کے آئینے میں'' - کاروانِ ملی کے تحت حسبِ ذیل مضامین مختلف حضرات کے ہیں (از صفحات ۲۹۵ تا ۳۸۶) ''قائداعظم اور خواتین'' ، ''قائداعظم کے چند معتمد ساتھی'' ، ''قائداعظم کے چند معتمد رفیق'' ، ''حاجی سر عبداللہ ہارون'' ، ''نواب بہادر یار جنگ'' ، ''راجہ صاحب محمودآباد'' -

اس کے بعد ''قائداعظم'' اور ''راہبر'' نامی دو نظمیں سعید اور کنور محمد اعظم خاں کی ہیں (ص ۳۸۷ تا ۳۹۳) - آخر میں افکار طلبہ کے تحت ایک نظم اور چند مضامین نظر آتے ہیں جو صفحات ۳۹۷ تا ۴۸۱ پر محیط ہیں - طلبہ نے مختلف عنوانات کے تحت اپنی نگارشات پیش کی ہیں -

خاتمے میں مرتب رسالہ مجلہ علم و آگہی ابو سلمان شاہ جہان پوری کا مضمون ہے ''تحریک ریشمی رومال اور سندھ (از صفحہ ۴۸۲ تا ۵۱۲) - اس موضوع پر موصوف نے تفصیلاً روشنی ڈالی ہے -

ہم گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی کے پرنسپل اور ان کے مرتبین کو اس علمی کوشش پر ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں - اگرچہ رسالہ ۱۹۷۷ء میں تاخیر سے چھپا - لیکن فراہمی مضامین کا مسئلہ ایک مشکل کام ہے - پھر ملک کے تمام ادارے اسی کام میں حسب توفیق و ہمت حصہ لے رہے تھے اس لیے یہ تاخیر بھی مفید رہی اور کارکنوں کو حسبِ منشا مجلہ مرتب کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی -

کلب علی خاں فائق

☆ ☆ ☆